ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۴۹

پانچواں سال: پہلی کتاب

جنوری ۲۰۰۷ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey_90@hotmail.com
فون: ۰۳۲۲-۶۱۲۵۶۷۲
کمپوزنگ: نذر خان (یونی کارن کمپیوٹرز چونگی نمبر ۶ ملتان)
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ اردو شاعری میں قنوطیت (قنوطیت کیا ہے؟ قسط اول) — قاضی عبدالستار — ۵
۳۔ خطوط بنام اقبال رشید صدیقی صاحب — لطیف الزماں خاں — ۲۰
۴۔ مجلّہ ''افکار'' کے اداریے — محمد اشرف کمال — ۲۴
۵۔ ابونصر الفارابی کے منتخب اقوال — ترجمہ: مبشر مہدی — ۳۵

دس غزلیں:

۶۔ دس غزلیں — صابر ظفر — ۳۹

انشائیہ:

۷۔ جھڑکیاں — سید تحسین گیلانی — ۴۴

کہانیاں:

۸۔ اٹھے ہوئے قدموں کی اڑتی ہوئی دھول — عبید راشدی رننگر چنا — ۴۷
۹۔ نئی رکھیل — وفا صالح راجپر رننگر چنا — ۵۰

''رفتگانِ ملتان'' از رضی الدین رضی:

۱۰۔ رضی الدین رضی کی ذات کے گنجھل — شاکر حسین شاکر — ۵۳
۱۱۔ ایک سنگ دل شخص کی کہانی — قمر رضا شہزاد — ۵۵
۱۲۔ رفتگانِ ملتان ۔۔ ایک تجزیاتی مطالعہ — فرح ذبیح — ۵۸

غزلیات:

۱۳۔ خاور اعجاز (۶ غزلیں)، سید ضیا الدین نعیم (۲ غزلیں)، مشتاق شبنم (ایک غزل) — ۶۷
حصیر نوری (۲ غزلیں)، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی (۲ غزلیں)، توقیر تقی (ایک غزل)، — تا
شارق بلیاوی (ایک غزل)، پرویز ساحر (۲ غزلیں)، کاشف مجید (۴ غزلیں) — ۷۷

حروفِ زر:

۱۴۔ قارئین کے خطوط — بنام مرتب — ۷۸

سید عامر سہیل

چند باتیں

کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ تیسری دنیا میں عموماً اور ہمارے یہاں خصوصاً ادبی نظریات، ان کی ترویج اور انہیں اختیار کرنے کے حوالے سے ''دانشورانہ فیشن'' کو بڑا عمل دخل حاصل ہے۔ایک زمانے میں ترقی پسندوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ زیادہ تر ترقی پسند زمانے کے فیشن اور چلن کے طور پر یہ نظریات اختیار کرتے ہیں۔بعض ادبی حلقوں کی طرف سے متواتر اسی انداز کی تنقیدی قیاس آرائیاں کی جاتی رہی ہیں کہ فلاں شخص فیشن کے طور پر ترقی پسند ہے یا ترقی پسند ہونا آج کے زمانے کا فیشن ہے وغیرہ۔یوں ایک طرف تو ترقی پسندانہ نظریات پر سوال قائم کر دیے گئے تو دوسری طرلوگوں کی نظریاتی وابستگی کو بھی مشکوک بنانے کی کوشش کی گئی تاہم وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے ہوتے چلے گئے۔

آج اگر دیکھا جائے تو ہمارے یہاں لسانی نظریات اور تھیوریز کا چلن ہے۔ہر دوسرا ناقد چاہے نہ چاہے ان نظریات پر بحث کرتا نظر آتا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ یہ لسانی نظریے اور تھیوریز آج کا فیشن ہے تو غلط نہ ہوگا۔مگر میں یہاں ان نظریات یا تھیوری کے حامی حضرات کو شک کی نظر سے نہیں دیکھ رہا اور نہ ان کی صداقت پر سوال قائم کیا رہا ہے بلکہ ان میں سے بعض لوگوں کے ذاتی رویوں کو مدنظر رکھا گیا ہے جو اس تضاد کا شکار رہے ہیں اور قارئین کو اس تضاد میں مبتلا رکھتے رہے ہیں۔میرے سامنے تو یہ تاریخی حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ کل جو لوگ ترقی پسندی کو فیشن قرار دیے رہے تھے ان میں بیشتر آج خود لسانی فیشن کے علمبردار ہیں۔ترقی پسند نقطہ نظر، روشن خیال اور مارکسی طریق مطالعہ کو مدنظر رکھ کر تنقید لکھنے والوں پر اعتراض کرنے والے اور انہیں ایک دائرے میں قید اور آزادی سے محروم قرار دینے والے آج خود تھیوری (جدید لسانی مباحث) کی قید میں مبتلا ہیں۔

مارکسی اور ترقی پسند اصطلاحات کا مذاق اڑانے والے ناقدین آج لسانی مباحث کی بھاری بھرکم اصطلاحات اور نقطہ ہائے نظر کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔''ماسکو نوازی'' جیسی پھبتی کسنے والے ان سرزمینوں کے بیج یہاں بونے کی کوشش میں مصروف ہیں جن کی بناوٹ اور موسم ان بیجوں کے لئے ابھی موافق نہیں ہے نیز جو تاریخی اور سماجی جواز ان کے لئے درکار ہے وہ ابھی اس سے محروم ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی معلومات کے ذرائع بھی دلچسپ ہیں کہ ہمارے یہاں بنیادی ماخذات کی بجائے ثانوی اور غیر اہم حوالوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔بات طویل ہوگئی، کہنا صرف یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے زمین و آسمان تو اپنے تھے اور ان کی اپنے معاشرے اور تبدیلی سے غیر مشروط وابستگی تھی مگر ہمارے یہاں نئے لسانی نظریات کی نہ تو زمین اپنی ہے نہ آسمان۔دیکھیں یہ فیشن کب تک چلتا ہے؟

ضروری وضاحت؛

قاضی عبدالستار کا شمار اردو دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ تحقیق و تنقید کا میدان ہو یا تخلیق کا طلسم کدہ، ان کا حوالہ نہایت اہم اور بنیادی بنتا ہے خصوصاً ان کے تاریخی ناول غالب، صلاح الدین ایوبی، خالد بن ولید اور داراشکوہ کو بہت زیادہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

''اردو شاعری میں قنوطیت'' قاضی عبدالستار کے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے جو ۱۹۵۷ء میں پیش کیا گیا تھا۔اس مقالے کے نگران رشید احمد صدیقی صاحب تھے۔اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ مقالہ بہت متنوع اور وسعت کا حامل بنتا ہے تاہم قاضی صاحب نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ نہایت بلیغ انداز میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ سے غالباً ۶۲۔۱۹۶۱ء میں شائع بھی ہوا تھا مگر اپنی محدود اشاعت کے سبب اب یہ نایاب ہے۔کتابی شکل میں اس کے صفحات کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ٹائپ میں شائع شدہ کتاب کا انتساب پروفیسر آل احمد سرور کے نام ہے۔

پاکستان میں قاضی عبدالستار کے دیرینہ دوست اور ہمارے بزرگ جناب لطیف الزماں خاں کی خواہش، شفقت اور اجازت سے اس مقالے کو'' انگارے'' میں قسط وار شائع کیا جا رہا ہے۔ہم اس حوالے سے خاں صاحب کے شکر گزار ہیں کہ ایک اہم موضوع پر کیا گیا اہم کام سامنے آ رہا ہے۔

''انگارے'' میں اس مقالے کو قسط وار شائع کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ قارئین اس اہم موضوع کا مطالعہ کر سکیں اور مکالمے میں شریک ہو سکیں۔۱۹۵۷ء میں جب یہ مقالہ پیش کیا گیا تھا تو اُس عہد کے تحقیقی تقاضوں اور معیارات کو مدنظر رکھا گھا تھا۔یہاں بھی مقالے کے اسی طریقہ کار کو برقرار رکھا گیا ہے۔ (مرتب)

قاضی عبدالستار (بھارت) باب اوّل: قسط اوّل

اردو شاعری میں قنوطیت

قنوطیت کیا ہے؟

قنوطیت جسے انگریزی میں pessimism کہتے ہیں، لاطینی لفظ Pessimus سے مشتق ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ مغربی اصطلاح ہے جس کا مفہوم زندگی اور دنیا کے بارے میں ایک یاس انگیز یا تاریک نقطہ نظر ہے۔

قنوطیت رجائیت کی ضد ہے۔ رجائیت کے نقطہ نظر کے مطابق یہ دنیا مجموعی طور پر خیر اور مسرت پر مشتمل ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں کی درمیانی کڑی Melorism ہے، جس کی رو سے اپنی تمام خرابیوں اور شر کے باوجود دنیا اور زندگی ترقی کر رہی ہے اور خیر کی منزل کی طرف گامزن ہے۔

قنوعیت کی توضیح اس طرح کی گئی ہے:

''قنوطیت کے نظرے کی رو سے یہ دنیا تمام امکانی دنیاؤں سے بدتر ہے۔ اگر کوئی اور دنیا ہوتی تو وہ اس سے زیادہ پُرالم اور بھیانک نہ ہوتی۔''(۱)

''قنوطیت ایک رنجور اور مایوس انسان کا نظریہ ہے، جس کے نزدیک یہ ساری دنیا دکھ کا کارخانہ ہے اور یہ دنیا ایسی دنیا ہے، جہاں ہر شئے فریب اور جبر ہے۔''(۲)

''قنوطیت کے نظرئے کے مطابق یہ دنیا تمام ممکنہ دنیاؤں سے بدتر ہے یا مکمل طور پُرالم اور شر مطلق ہے۔''(۳)

''قنوطیت ایک ایسا نظریہ حیات ہے جو یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ دنیا مطلق بدی، یک سر پُرالم اور گرفتاری ہے۔''(۴)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قنوطیت ایک ایسا نقطہ نظر ہے جس کے مطابق یہ دنیا بدترین دنیا ہے، اور بنیادی طور پر زندگی رنج و محن کی زندگی ہے۔ لیکن عصر قریب کے بعض مفکرین قنوطیت کی تشریح و توضیح میں نسبتاً معتدل الفاظ اور نرم انداز بیان سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً جیمس سولے اس فلسفے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''قنوطیت ایک نظریہ ہے جس کی رو سے یہ دنیا مجموعی طور پر بری ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ تمام ممکنہ یا امکانی دنیاؤں سے بدتر ہے جیسا کہ لوگ

رجائیت کے برعکس اس کے متعلق قیاس کرتے ہیں۔ قنوطیت کے معنی صرف یہ ہیں کہ یہ دنیا بری ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو اچھا ہوتا۔''(۵)

اگر ''ممکنہ'' اور ''امکانی دنیاؤں'' کے الفاظ مندرجہ بالا جملے سے نکال دئے جائیں اور اس مقولے سے صرف زندگی اور دنیا کے متعلق ایک رویے کا تعین کیا جائے تو بھی قنوطیت اپنے بنیادی معنی میں برقرار رہتی ہے۔ کیونکہ یہاں بھی دنیا اور زندگی شر مطلق، یاس محض اور بدی ہے۔ میرے نزدیک قنوطیت کی یہی تعریف جامع اور مکمل ہے۔ کیونکہ ''ممکنہ'' اور ''امکانی دنیاؤں'' کے الفاظ ایک حد تک گمراہ کن ہیں۔ اس لئے قنوطیت کے معنی یہی سمجھنا چاہئے کہ مجموعی طور پر یہ دنیا اور زندگی مصیبت ہے۔ نفی کا مفہوم (negation) تو خود بخود پیدا ہو جائے گا، کیونکہ کوئی صحت مند انسان کسی مصیبت، کسی شر اور کسی بدی کو محض کسی مصیبت، کسی شر، اور کسی بدی کی خاطر اپنانا پسند نہ کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ اس کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا کہ ''۲+۲=۴'' کے حسابی یا منطقی اصول کی طرح کسی فلسفیانہ یا ادبی اصطلاح کے معنی قطعی انداز میں نہیں بیان کئے جا سکتے۔ مثلاً کوئی شخص کہتا ہے:

(ب) کاش میں پیدا نہ ہوا ہوتا،

(الف) یہ دنیا بری ہے،

(ج) کاش مجھے موت آ جاتی،

ان جملوں میں بظاہر کوئی لفظ مشترک نہیں ہے، لیکن مجموعی طور پر ان میں سے ہر جملے کا ہمارے دل پر ایک یاس انگیز اثر ہوتا ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان تینوں جملوں میں قنوطیت موجود ہے۔

عام طور سے جن سنگین حقائق پر قنوطیت کی بنیادیں رکھی جاتی ہیں، کوئی بھی رجائی فلسفہ حیات ان کی الم ناکی اور ابدیت کو ختم نہیں کر سکا۔ بیماری، موت، بھوک، پیاس، دنیاوی دکھ درد اور جذباتی ناآسودگیاں وہ مسائل ہیں جن کی فراوانی انفرادی دماغوں میں قنوطیت کے بیج بوتی ہے۔ قنوطیت اپنے غمگین ذاتی تجربات اور اپنی گزشتہ و موجودہ شکستوں سے اس درجہ متاثر اور مغلوب ہو جاتی ہے کہ دنیا میں اسے ہر چیز دُکھ بھری نظر آتی ہے۔ کرب والم جب نقطہ نظر بن جاتا ہے تو قنوطیت کہلاتا ہے۔ جب انسان اپنی جبلی ضرورتوں کی تکمیل کے سلسلے میں مستقل محرومیوں اور پیہم ناکامیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور جب یہی محرومی و ناکامی اس کی شخصیت کو تباہی و بربادی کی پُر پیچ راہوں سے گزار کر موت کے دروازے پر لا کھڑا کرتی ہے اور جب وہی تھکا ہارا درماندہ انسان اپنے تجربات کے آئینے میں کسی نظام فکر کے گیسو سنوارتا ہے، یا کسی انفرادی شکست کو آفاقیت کی قبا پہناتا ہے یا تمام دنیا کو اپنے ذاتی ناکام تجربے کے کفن میں لپیٹ کر شعر و ادب کے سانچوں میں ڈھالتا ہے تو، ہم اسے قنوطیت، کہتے ہیں۔ غم کا مستقل احساس و ادراک قنوطیت پر دلالت کرتا ہے(۶)۔ یہی ذہنی کیفیت اگر غیر منقطع طور پر موجود ہو تو ہم اسے قنوطیت کہیں گے۔ اس طرح قنوطیت کو ہم دو خانوں میں بانٹ سکتے ہیں:

۱۔ مدلل نظام فکر یا فلسفیانہ جواز
۲۔ فکر یا جذبے کا مستقل موڑ

مغربی فلاسفہ میں سب سے پہلے شوپنہار نے اس فلسفہ حیات پر مدلل بحث کی ہے، لیکن قنوطیت کے آثار ابتدائے آفرینش کی اولین تہذیبی کارناموں میں بھی کسی نہ کسی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ بدی کا وجود نیز مصائب اور گناہ کا تعلق قدیم اسرائیلی صحیفے کا اہم موضوع ہے۔ وہ اسرائیلی مفکر جو Ecelislastes کا مصنف ہے زندگی کی منفی قدروں کے راگ الاپتا ہے اور اپنے ماتم کی تان ''مایا'' پر توڑتا ہے، اور دنیا کو vanity of vanities کہتا ہے:

ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

ثبوت میں وہ پیغمبر کا قول نقل کرتا ہے کہ یہ دنیا سرتاپا فریب ہے:

عالم دلیل گمرہی چشم و گوش ہے

''افلاطون نے مسرت کو مثبت قدر ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے نزدیک مسرت نہ کوئی مثبت قدر ہے اور نہ اس کا انفرادی وجود ہے بلکہ مسرت زندگی کی ایک جبلی طلب یا تشنگی کی سیرابی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض جگہ افلاطون نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جن کا اثر سماجی زندگی کی برکات کے لئے مہلک ثابت ہوسکتا ہے۔''(۷)

مثلاً وہ کہتا ہے:

''سماج سے کنارہ کش رہ کر غور و فکر کی زندگی مبارک زندگی ہے۔''(۸)

اس مقولے پر اگر دنیا کاربند ہو تو عجیب و غریب نتائج برآمد ہوں گے۔ یعنی سماج سے دوری کی تلاش پہلے دشت و صحرا کو آباد کرائے گی، اور پھر وہاں بھی ایک نئے سماج کی، نئے نظام کی تشکیل کے آثار دیکھ کر نئے کوہ و صحرا کی جستجو میں سرگرم سفر ہو جائے گی۔

افلاطون کے اثر سے نو فلاطونیت (Neoplatonism) اور رواقین (stoics) کے تصورات میں قنوطیت لاشعوری طور پر اپنے مدہم آب و رنگ میں پرورش پاتی ہے۔ یعنی ان ہر دو نظام فکر نے انسان کی جبلی فطرت اور جسمانی عشرت کی نہ صرف سختی سے مخالفت کی ہے اور انسان کو اپنی فطری آرزؤں کی آسودگی سے باز رکھا ہے بلکہ ان کو خیالی اور فکری اصولوں پر قربان کر دیا ہے۔ یہ قربانی بھی قنوطیت کے اثرات سے مملو ہے۔

تمام مذاہب اور جملہ مدارس فکر میں قنوطیت کی سب سے مکمل اور واضح شکل بدھ مذہب میں ملتی ہے(۹)۔ تمام مغربی حکما اس پر متفق ہیں کہ بدھ مذہب قنوطیت کا علم بردار ہے۔ ویدانتی فلسفہ ایک طرف بدھ قنوطیت کا سرچشمہ اور دوسری طرف بذاتِ خود ایک قنوطی فلسفہ حیات ہے۔ قبل اس کے کہ

ویدانتی فلسفہ حیات کا ذکر کیا جائے یہ واضح کر دینا ضروری ہے، جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ قنوطیت سراسر مغربی فلسفیانہ اصطلاح ہے۔ اس لئے مغرب ہی کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں قنوطیت کا مفہوم متعین کرنا چاہیے۔

ازمنہ قبل تاریخ میں جب آریہ ہندوستان میں وارد ہوئے اور انہوں نے دیسی ہندی قوم کو زیر کیا تو سندھ اور گنگا کے میدانوں میں آباد دراوڑی اقوام کی کثیر تعداد فاتحین کے لئے اپنی سرزمین چھوڑ کر دکن کی طرف ہجرت کر گئی۔ لیکن پوری آبادی کا منتقل ہونا ممکن نہ تھا۔ قیاس ہے کہ آبادی کا بڑا حصہ فاتح قوم کے رحم و کرم پر بھروسہ کر کے یہیں رہ پڑا ہوگا۔ فاتحین نے سماجی زندگی میں اس حصہ آبادی کو بڑی حد تک غلام بنا دیا اور مفتوح قوم سے شادی بیاہ سختی سے ممنوع قرار پایا۔

آریاؤں کا رنگ گورا، قد بلند اور خطوط سبک تھے، ان کے برعکس دراوڑی کالے، کوتاہ قد اور بدہیئت تھے۔ اس لئے وہ سماجی عوامل اس شدید نسلی معاشی اور تہذیبی تعصب کی فضا میں پیدا ہی نہ وہ سکے جو دو قوموں کے صدہا برس ایک ساتھ رہنے سے وجود میں آتے ہیں اور دونوں قوموں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ آریہ اپنی تہذیب ساتھ لائے تھے جو مغلوب قوم کی تہذیب سے فروتر ہوتے ہوئے بھی فاتح قوم کی تہذیب تھی، اس لئے وہ نہ صرف غالب آئی بلکہ اس نے دراوڑی تہذیب کو سرے سے ختم ہی کر دیا۔ مغلوب قوم کا بساط تہذیب سے اس طرح خارج کیا جانا ہندوستان کے طبقاتی نظام کی خشت اول تھی۔ پھر تاریخی اور سماجی ارتقا نے چار عظیم ذاتوں کو جنم دیا۔ مذہبی خدمات برہمنوں کو تفویض ہوئیں، جنگی مہمات چھتریوں کو ملیں اور تجارت ویش کے حصے میں آئی، اور ان سب ذاتوں کی سیوا شودر کا مقدر بنی۔ گمان غالب ہے کہ شودر کا طبقہ مفتوح قوم کے افراد پر مشتمل رہا ہوگا۔ اس طبقاتی نظام میں مذہب کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس میں کسی طرح کی تبدیلی کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مقدس کتبے شاہد ہیں کہ یہ تقسیم انسانی نہیں ازلی اور آسمانی ہے۔ برہما نے اس عالم کو پیدا کیا، اسی نے بنی نوع آدم کو جنم دیا اور وہی اس تقسیم کا بھی خالق تھا۔(۱۰)

برہمن نے، جسے سماجی برتری کا شرف حاصل تھا، اپنے دنیوی اغراض و مقاصد کے تحفظ اور ان کی تکمیل کے لئے، نیز انسانی سرشت کی ازلی بغاوت کو کچلنے اور تمام دنیاوی محرومیوں کی تسکین کے لئے ''آواگون'' کا نظریہ رائج کیا(۱۱)۔ دنیا کے تمام مذاہب نے، ''حیات بعد الموت'' کے سائے میں، انسان کو اخلاقی زندگی کی برتری کے خواب دکھائے ہیں، لیکن برہمن نے ''حیات قبل از حیات'' کا نظریہ پیش کیا۔ جس کی رو سے یہ جہان اور یہ زندگی اپنے ہی نیک یا بد اعمال کی موجودہ و مقررہ سزا ہے۔ ایک طرف تو یہ نظریہ انسان کے اس فطری سوال کا جواب ہے کہ ہم برہمن یا شودر کیوں پیدا ہوئے، اور دوسری طرف اس زندگی کو عذاب کی طرح جھیل کر آئندہ زندگی ___ ''حیات بعد الموت'' کی امید میں صبر و قناعت اور محکومی و چاکری کا خوبصورت جواز ہے۔

زندگی کے وہ فرائض وعوامل جو کسی نظریہ حیات کو رجائی یا قنوطی بناتے ہیں اس مقام سے قنوطی رنگ اختیار کرتے ہیں۔ ایک مفلس اور مفلوک الحال شودر اس لئے زندگی کی سختی جھیل رہا ہے کہ اس نے اگلے جنم میں پاپ کئے تھے۔ اور اب اگر اس نے ''کرم'' کے لکھے کو بدلنا چاہا تو وہ آئندہ جنم میں اس سے بھی زیادہ محنت ومحن کی زندگی پائے گا۔ دوسری طرف وہ ازلی خوش نصیب برہمن ہے، جس کا درجہ سماج میں سب سے بلند ہے اس کے بارے میں وید مقدس کی نوید یہ ہے کہ

''برہمن کو دنیا کی حقیر ضرورتوں سے بے نیاز ہو کر مقدس وید کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے جو اس کا مقدس ترین فرض ہے۔ اس کو نفس کشی اور ریاضت میں دن گذارنا چاہئے۔'' (۱۲)

پھر ''نفس کشی'' اور ''ریاضت'' کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے:

''برہمن کو ساری دنیاوی ضرورتیں تپسیا کی آگ میں بھسم کر دینا چاہئے، یہاں تک کہ اسے موت آجائے۔ مرتے وقت آفاقی اور دوامی ذات (خدا) سے واصل ہونے کی اسے صرف طلب ہونی چاہئے۔ اس طرح وہ عواطف سے پاک عالم میں غیر ذات (برہما) کا جزو ہو سکتا ہے اور صرف اسی طرح وہ اواگون کی زنجیر سے نجات پا سکتا ہے۔ یہی واحد اور مکمل نجات ہے۔'' (۱۳)

یہ ان پیدائشی پاک نژاد برہموں کی راہ نجات ہے جو دنیا کی تمام عشرتوں اور آسائشوں کے وارث ہیں۔ یہ دروازہ صرف برہموں کے لئے کھلا ہوا ہے، تاہم دوسری ذاتوں کے لوگ بھی نجات پا سکتے ہیں۔ مگر اس طرح:

''دوسری ذاتوں کے صرف وہ لوگ یہ نجات حاصل کر سکتے ہیں، جنہوں نے اپنے گھر بار تج دئے ہوں، جو یوگیوں کی طرح رہتے ہوں اور جو وہ تمام علائق ختم کر چکے ہوں جو کسی طرح بھی انہیں دنیا سے وابستہ کر سکتے ہیں۔'' (۱۴)

ان دوسری ذاتوں میں شودر کا شمار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ:

''برہمن انہیں (شودر کو) مذہبی تعلیم نہیں دے سکتا، ورنہ اس کی عاقبت بھی وہی ہوگی جو شودر کا مقدر ہو چکی ہے۔'' (۱۵)

اتنا ہی نہیں بلکہ ''اپنشد'' کی رو سے:

عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے

اور یہ دنیا شر محض ہے، جہاں:

''صرف آتما کا وجود ہے باقی جو کچھ بھی ہے ایک پرچھائیں اور ایک بدی ہے۔ یہ کائنات مایا ہے، سایہ ہے اور شر ہے۔ اس پرچھائیں اور بدی کا آرزومند ہونا

بہت بڑی بدی اور ساری بدیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کو ٹھکرا دینے ہی میں مکمل نجات ہے یہاں تک کہ موت آجائے۔'' (۱۶)

اس طرح فلسفہ ومذہب کے نقطہ نظر سے ایک ایسا نظام حیات وجود میں آتا ہے جس کی رو سے یہ زندگی بذات خود ایک عذاب ہے اور یہ دنیا مایا اور بدی ہے۔ بدیوں کا سرچشمہ ہے۔ ان بدیوں سے اس وقت تک رستگاری ممکن نہیں جب تک کہ خود اس زندگی ہی سے نجات حاصل نہ کر لی جائے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے چکر ہی سے نجات حاصل کرنا چاہئے جس کا نتیجہ ''آواگون'' ہے۔

اتنا سمجھ لینے کے بعد قنوطیت کو ہم آسانی سے تین خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ قنوطیت باعتبار ماحول

۲۔ قنوطیت باعتبار مزاج

۳۔ قنوطیت کا فلسفہ جواز

اس تقسیم پر بحث کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان تینوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ سب سے پہلے انسان پیہم ناکامیوں سے مجبور ہو کر قنوطی ہوتا ہے۔ پھر اس کے شکست خوردہ انفرادی تجربات زندگی کے ہر رخ کا صرف تاریک پہلو دیکھتے ہیں۔ اس طرح قنوطیت اس کا مزاج بن جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے نصب العین کی اہمیت اور حقیقت کو منوانے کے لئے ایک فلسفیانہ جواز ڈھونڈتا ہے۔ اس طرح قنوطیت کے یہ تین حصے الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے متعلق رہتے ہیں۔ ہندوستانی قنوطیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مغربی مفکر کہتا ہے کہ

''ان کی قنوطیت کے فلسفے کی رو سے یہ دنیا فریب، سراسر فریب ہے۔''

ہندوستان میں قنوطیت کا مکمل اور واضح وجود مسلم ہے۔ البتہ اس کے اسباب وعلل میں اختلاف رائے ضرور ہے۔ مثلاً:

''ہندوستان کے آب وگل میں قنوطیت کے جراثیم موجود ہیں۔'' (۱۷)

اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بیان بھی ہم کو ملتا ہے:

''جب ہم تخیلی اور ذہنی بیداری کے شعبوں پر غور کرتے ہیں تو ماحول بہت اہمیت رکھتا ہے بیشتر آبادی میدانوں میں رہتی ہے جہاں فطرت کی تعدی ظاہر ہے۔ مثلاً بے وقت اور بے پایاں بارش، سیلاب جھلسا دینے والی گرمی، زلزلے، وبا اور بیشتر آبادی کا از مہد تا لحد روٹی کے لئے سرگرداں رہنا۔ یہ حالات مجموعی طور پر قنوطیت کے معین ہوتے ہیں۔ ناسازگار حالات کی پیدا کردہ مجبوریاں ان کو خیالی دیوتاؤں کی پرستش پر مائل کرتی ہیں، اور ازلی طبقاتی تقسیم کی مضبوط گرفت آزادی اور عمل کے تخیل کو پابجولاں رکھتی ہے۔ تاہم میدانوں میں بسنے والوں کی

فطری غم ناکیاں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔'' (۱۸)

ہندوستان میں آریوں کی یلغار تاریخ کا ایک الم ناک دور ہے۔ ویدک دور سے اپنشد کے زمانے تک فکری طور پر رجائیت کی آگ بجھتی رہی اور قوم قنوطیت کی طرف مائل ہوتی گئی۔ مثلاً ویدوں میں پھالی کی عبادت ممنوع ہے مگر آگے چل کر یہ عام ہوتی جاتی ہے۔ مقدس وید میں کہیں بھی ''آواگون'' کا عقیدہ نہیں ملتا لیکن اپنشد کے زمانے میں یہ ایک بنیادی مسئلہ کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ مذہبی عقاید اور عبادات میں یہی تغیر بحث طلب ہے۔ اس کا امکان ہے کہ ہندوستان کی آب وہوا نے، معاشی وسائل کی تنگ دامنی نے خانہ جنگیوں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں سے مسلسل لڑائیوں نے، جن کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا، حملہ آور فاتح آریوں کو، ان کی فطری اور ذہنی قوتوں کو سلب کئے بغیر، قنوطی بنا دیا ہو۔

اس سلسلے میں مغربی مفکرین بڑے شدومد کے ساتھ Kipling کے Kim کو یہ کہہ کر بہ طور مثال پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان کی فضا نے ذہنی طور پر اس کو مشرقیت کا اس درجہ دل دادہ بنا دیا کہ تبت کے خانہ بدوشوں میں شامل ہو کر وہ یوگیوں کا شاگرد ہو گیا اور ترک دنیا کر بیٹھا۔

تین چیزیں قنوطیت نظرئے کی صند ہیں ہیں جو قنوطیت اور رجائیت کے درمیان حد فاصل ہیں:

۱۔	غلط علم یا دھوکہ	۱۔	صحیح علم یا حقیقت
۲۔	محسوساتی بے چینی یا کرب	۲۔	محسوساتی بے چینی یا چین
۳۔	نیکی یا خیر	۳۔	بدی یا برائی

ہندو نظام فکر کے نزدیک مجبوریاں یا مصیبتیں لاعلمی ناواقفیت، جہل یا نادانستگی اور اودیا (۱۹) کی دین ہیں۔ اودیا ہی مصیبت کا موجب ہوئی ہے۔ یعنی فکری طور پر جو لاعلمی ہے وہ جذباتی طور پر مصیبت ہے۔ برہمن کی تعریف میں بھی فکر اور جذبہ کا یہی تعلق موجود ہے۔

''برہمن حقیقت، ودیا، اور خیر ہے'' (۲۰)

ہندوستانی فلسفہ واقفیت پر زیادہ احساس پر کم زور دیتا ہے۔ اس میں مرضی یا خواہش (volition) جس پر اسرائیلی اور عیسائی نظام فکر نے مغرب میں توجہ دی ناپید ہے۔ اس ''مایا'' (کائنات) کی واقفیت ہی بڑا علم ہے۔ اگر کسی نے ''مایا'' کی اہمیت اور حقیقت کا راز پالیا تو وہ یقیناً دنیا سے بیزار ہو کر سنیاس لے لے گا اور زندگی کی زنجیر سے آزاد ہو جائیگا۔ مرضی جو نیکی یا بدی اختیار کرنے یا نیکی و بدی کے تعین میں بڑا کارنامہ انجام دیتی ہے۔ ہندو فلسفہ اس سے بے تعلق ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستانی فلسفہ مقدس وید کی روشنی میں احکام صادر کرتا ہے۔ عقلی دلائل سے ان کا جواز پیش کرنے کی فکر کم کرتا ہے۔

مرضی اگر منفی ہوتی ہے تو وہ خیر اور شر میں فرق واضح کر کے اپنے لئے ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیتی ہے۔ مرضی میں غور و فکر کا شائبہ مضمر ہوتا ہے نتائج کچھ بھی ہوں۔

چونکہ ہندوستان نے اپنے فلسفے میں مرضی کو کوئی مقام نہیں دیا اس لیے میکڈونل (۲۱) کہتا ہے کہ ابتدائی ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس نے زندگی اور دنیا کی حیثیت ہی نہ تسلیم کی اس لئے کوئی کارنامہ نہ انجام دے سکا۔ برہمن اس تصور کے قائل رہے کہ دنیا اور زندگی دونوں بذات خود بدی ہیں۔

یوگ کا ذکر کرتے ہوئے بلوم فیلڈ کہتا ہے:

''قوم کے لئے کوئی اُمید کا پہلو ہی نہیں سارا فلسفہ گذشتہ کا ماتم، حال کا رونا اور مستقبل سے بیزاری اور افرموشی ہے۔'' (۲۲)

یہ تھا قنوطیت کا وہ فلسفیانہ ورثہ جس پر بدھ مت کی قنوطی عمارت کی بنیادیں رکھی گئیں۔ بدھ مت کی قنوطیت کا ذکر کرنے سے پہلے اس دور کا سرسری جائزہ لے لینا ضروری ہے جس میں اس کا ظہور ہوا۔

سری کرشن کی وفات کو ایک مدت ہو چکی ہے۔ بھگوت گیتا کی تعلیم پر فرسودگی طاری ہے۔ مہابھارت کی رزمیہ شاعری کتابوں کی زینت بن چکی ہے۔ راجہ یدھشٹر اور دریودھن کی اٹھارہ چھاونی فوج کا خون داستان پارینہ ہو چکا ہے۔ شمالی ہندوستان میں اٹھارہ ریاستیں خودمختاری کے لئے باہم دست گریباں ہیں۔ مغربی سرحد پر کیانی پرچم کے سائے پڑنے لگے۔ جنوب میں دراوڑی سلطنتیں دیرینہ تاریخی تعصب کی بنیاد پر شمالی ہند کی ریاستوں کے خلاف صف آرائی پر آمدہ ہیں۔

ہندوستان کی مرکزیت ختم ہو چکی ہے تہذیب وتمدن اور صلح وسکون کے وہ لمحے جو صحت مند فلسفے اور عظیم ادب کی تخلیق کرتے ہیں، ناپید ہیں۔ خانہ جنگیوں اور سیاسی فتہ سامانیوں نے معاشی وسائل کو درہم برہم کر دیا ہے۔ جس کا عموماً نچلے طبقے پر فوری اور تباہ کن اثر پڑتا ہے۔ جنگ کی وجہ سے زرعی اور صنعتی پیداوار کی بربادی اور غیر محفوظ راستے ملک کی سیاست ومعیشت کے ساتھ ساتھ قوم کے اخلاق اور تصور حیات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ٹکسلا اور بنارس میں مقدس وید کی تعلیم جاری ہے مگر شودر یعنی ملک کی بڑی آبادی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ویدانت پر عمل درآمد موقوف ہے اور کرم کھنڈ کا سکہ جاری ہے برہمنوں کا فرمان مقدس وید کے احکام سے بھی بالاتر ہے۔ عیش کوشی برہمنوں کو نفس کشی اور ریاضت کرنے کی فرصت نہیں دیتی۔ ویش اور شودران کی چاکری میں مصروف ہیں چھتریوں کی تلواریں برہمنی عشرت کدوں کی دربانی کر رہی ہیں۔ ویش اور شودر مذہبی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنے پچھلے جنم کے پاپوں کے عوض زندگی کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ان کے لئے نجات کا کوئی سوال نہیں۔ برہمنوں کے وسیلے سے صرف دنیاوی منفعت کسی حد تک وہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی کڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ دیوتاؤں کی رضا حاصل کرنے کے لئے ایک بار بنارس کی سڑکوں پر مچھلی اور گوشت کا انبار لگ جاتا ہے اور دیگوں میں شراب بھری جاتی ہے۔ راجگڈہ میں ایک بار تمام خلقت قبول دعا کے لئے ساری رات عبادت اور شراب نوشی کرتی رہتی ہے۔ راجہ بنارس کے دربار میں سولہ ہزار خوبصورت ناچنے والیاں کمال فن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ہاتھی گھوڑوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کی بھی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔

اسی زمانے میں کپل وستوں کا شاہزادہ گوتم تمام کائنات کا دکھ درد سمیٹ کر اس کا علاج ڈھونڈتا ہے۔اس کا دکھا ہوا دل زندگی جیسی نعمت کا احترام بھی کرنے سے قاصر ہے۔(۲۳)

دنیا میں انسانیت کے خون سے جلنے والے چراغوں کی بھیانک روشنی نے اس کی روح میں اتنا درد بھر دیا کہ وہ بے اختیار چیخ اٹھا کہ

پیدائش دکھ ہے
عارضہ دکھ ہے
موت دکھ ہے
اندوہ وغم دکھ ہے
پیاری چیزوں کا حصول دکھ ہے
پیاری چیزوں کی مفارقت دکھ ہے
آہ وزاری دکھ ہے
ناکام خواہش دکھ ہے

گوتم بدھ کے فلسفیانہ خیالات کا لب ولباب یہ تھا کہ ہر وہ چیز جو جسم رکھتی ہے مادہ سے بنی ہے۔مادہ غیر مستقل اور فانی ہے۔اس لئے جسم رکھنے والی ہر چیز میں فنا کے آثار موجود ہیں۔انسان بھی حیات جسمانی رکھنا ہے اس لئے اس کو بھی فنا کے مدارج ہیں گوتم بدھ کا فلسفہ یہ تھا کہ

''جو چیز انسان کا مادی دنیا سے رابطہ قایم رکھتی ہے وہ دل کی برائی ہے۔جب تک دل میں ذرہ برابر بھی بدی رہے گی دنیا سے علاقہ ختم نہ ہوگا۔بدھ مت کا مشہور سدھانت جس کا نام، تیل کھانا، بمعنی تین خصوصیتیں ہے اور جو بدھ مت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے کہتا ہے۔''(۲۴)

''سب چیزیں عارضی ہیں (جسے پالی میں اینکا کہتے ہیں)
سب چیزیں دکھ ہیں
''سب چیزیں بلاشخصیت کے ہیں (جسے انا تا کہتے ہیں)''

لفظ انا تا کا ترجمہ مشکل ہے۔اس کو، بے ثبات، بے اصل اور بے روح کے ہم معنی سمجھا جاسکتا ہے۔

دنیا کے بیش تر مذاہب نے آنے والی زندگی کی بشارت دے کر لوگوں کو زندگی کے جبر وقہر سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیا مگر اس کے برعکس بدھ مذہب نے انسان کے ہاتھ سے یہ کھلونا بھی چھین لیا۔بدھ نے آنے والی زندگی کو بھی دکھ سے تعبیر کیا۔ان کے نزدیک نہ صرف یہ دنیا بلکہ تمام امکانی دنیائیں دھوکا فریب اور پرمحن ہیں اور نجات حاصل کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ خواہش کو ختم کر دیا جائے (خواہش سے مراد وہ خواہش ہے جو زندگی کے چکر کو حرکت میں رکھتی ہے) یعنی زندگی کا چکر ہی ختم

کر دیا جائے۔

بدھ کے مقالات میں ایک ''دوازدہ اصول'' کا اکثر ذکر آیا ہے، جن میں علت اور معلول کا باہمی تعلق باقاعدہ اور مفصل طور پر پیش کیا گیا ہے۔یہ بارہ اصول، جن کو ''نیکا سام پادہ'' کہتے ہیں، حسب ذیل ہیں:(۲۵)

۱۔ اودیا کے انحصار سے ترکیب پیدا ہوتی ہے جسے سنکھار بولتے ہیں۔
۲۔ تراکیب کے انحصار سے شعور ظہور میں آتا ہے۔
۳۔ ترکیب کے انحصار سے جسم کا تعلق ہے، یعنی انسان پیدا ہوتا ہے۔
۴۔ جسم کے تعلق سے ''شش کلی عالم حواس'' پیدا ہوتا ہے جسے اندریا کہتے ہیں۔
۵۔ ''شش کلی عالم حواس'' کے احساس سے اشیاء کی حس پیدا ہوتی ہے۔
۶۔ حس کے انحصار سے احساس پیدا ہوتا ہے۔
۷۔ احساس کے انحصار سے ہوش پیدا ہوتا ہے۔
۸۔ ہوش کے انحصار سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔
۹۔ لگاؤ کے انحصار سے ساخت پیدا ہوتی ہے۔
۱۰۔ ساخت کے انحصار سے جنم پیدا ہوتا ہے۔
۱۱۔ جنم کئے انحصار سے غم، درد، الم، اندوہ، یاس، بڑھاپا، اور موت پیدا ہوتی ہے۔
۱۲۔ اس طرح دکھ کا سارا توندہ بن جاتا ہے۔

اس طور پر مغربی فلاسفہ کے نزدیک بدھ مت کی کٹر قنوطیت مسلم ہو جاتی ہے۔اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ زندگی اور یہ دنیا مسلسل درد اور مجسم دکھ ہے۔بدھ کی تعلیم اور اس کی قنوطیت پر کسی قدر تفصیل سے اس لئے گفتگو کی گئی ہے کہ اس نوع کی قنوطیت کی دھوپ چھاؤں ہماری شاعری میں طرح طرح سے ملتی ہے۔ہندو فلسفے اور بدھ مت کی قنوطیت تاریخی طبعی اور اپنے ماحول کے فطری نتائج کی صورت میں اپنا جواز پیدا کر لیتی ہے۔لیکن شوپنہار کی قنوطیت ان سے علیحدہ ہے اور مختلف بھی۔شوپنہائر کی قنوطیت طبعی معلوم ہوتی ہے۔کیوں کہ سیاسی میدان میں شوپنہائر کا جرمنی بڑے زرین خواب دیکھ رہا تھا۔قوم کا انداز نظر مجموعی طور پر رجائی تھا۔خود شوپنہاور کی زندگی میں زیادہ مدت تک اس کی تصانیف کی عدم مقبولت کا سبب اس کا اور عوام کا فکری تضاد ہو سکتا ہے۔یعنی رجائی تصورات میں مگن قوم نے اس کے قنوطی تصورات کو سنتے اور سمجھتے اور قبول کرنے سے انکار کر دیا، جس کی وجہ سے ایک مدت تک شوپنہار قعر گم نامی میں پڑا رہا۔

شوپنہائر اچھا خاصا کھاتا پیتا آدمی تھا۔اپنی ماں کی ممتا سے محرومی اور سوتیلی ماں کا عذاب اپنی جگہ پر مسلمہ ہے۔مگر اس ایک الم کا شوپنہاور کی طویل عمر کو اس طرح گرفت میں لے لینا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی مسکرا نہ سکے کچھ زیادہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔بہر حال ان شکوک کو نظر انداز کر دینے کے

بعد بھی اس کی قنوطیت اپنی جگہ پر باقی رہتی ہے۔ وہ نہاد اور مزاج کے اعتبار سے قنوطی تھا۔ اس نے اپنی افتادِ طبیعت کا فلسفیانہ محاسبہ کیا۔ ایک نقاد نے اس کی قنوطیت کے متعلق کہا ہے کہ

''شوپنہائر کی قنوطیت اٹھارویں صدی کی بے قید رجائیت کا ایک ردِعمل تھی۔''(۲۶)

شوپنہائر جب مرضی یا ارادہ کو قادر قرار دیتا ہے تو اسے اس کا خیال رہتا ہے کہ یہی مرضی یا ارادہ (will) بدی کا خالق ہے، جس کا وہ آگے چل کر ذکر کرے ہے۔

ایرانی پیغمبر زرتشت نے سب پہلے خیر و شر کا فلسفیانہ ادراک کیا اور یزداں اور اہرمن کے ناموں سے تاریخ و ادب میں ان کو روشناس کیا۔ یہی خیر و شر اس کے نیم فلسفیانہ اور نیم مذہبی ارشادات کا حاصل ہے وہ کہتا ہے کہ

''دنیا میں ہمیشہ یزداں و اہرمن کی کشمکش جاری رہے گی۔ دانا وہ ہے جو یزداں کا رفیق ہو کیونکہ بالآخر یزداں ہی کی فتح ہوگی۔''(۲۷)

اس طرح بدی کی موجودگی قدیم ہے۔ لائبنز نے (Theism) کی تبلیغ کرتے ہوے بدی کے وجود کا فلسفیانہ جواز بھی پیش کیا ہے۔

دنیا خدا کی تخلیق اسوقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کے روشن اور تاریک دونوں پہلو واضح نہ ہوں اس لئے دنیا میں خیر کے ساتھ ساتھ بدی بھی ہے۔ مگر صرف بدی نہیں۔ یہی رفتار خیر کے بدی پر فتح پانے کے امکانات ہیں۔''(۲۸)

اسی بنیاد پر شاید پوپ نے اعلان کیا تھا:

''ہر جزوی شر، عالمگیر خیر ہے۔''(۲۹)

ہیگل نے بھی (theism) کے منارے سے بدی کے وجود کا بلند بانگ اعلان کیا:

''بدی کے وجود سے انکار کرنا نادانی ہے مگر اس پر فتح پانا انسانیت کا فرض ہے۔''(۳۰)

سب سے پہلے شوپنہائر نے (Theism) کی مذہبیت پر کاری ضرب لگائی:

''جگنوؤں کی مانند مذاہب اندھیرے کے محتاج ہیں۔''(۲۹)

پھر اس نے (will) مرضی یا ارادہ کی ازلیت، آفاقیت اور قدرت پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

''(will) مرضی یا ارادہ اندھی اور مسلسل جدوجہد کرتی ہوئی ایک طاقت ہے جو نہ اپنے کو تسکین بخش سکتی ہے نہ اپنے دردناک چکر سے نجات پا سکی ہے اور یہی مرضی یا ارادہ تمام دکھوں کا دروازہ ہے۔''(۳۱)

پھر وہ اس پر مرضی یا ارادہ کا انسانی زندگی پر اثر دیکھتا ہے جسکا حیات انسانی سے ناگزیر تعلق ہے۔

''جب تک ہمارے شعور میں مرضی یا ارادہ موجود ہے ہم خواہش کے کانٹوں کا مقدر ہیں۔ جب تک ارادہ یا مرضی ہم پر حاوی ہیں ہم سکون اور خوشی نہیں پا سکے کیونکہ یہی مرضی یا ارادہ دنیا کی بنیادی طاقت بھی ہے۔ دنیا کو بروئے کار لانے والی شے بھی ہے۔ اور بدیوں کی خالق بھی ہے۔''(۳۲)

شوپنہائر خوشی یا مسرت کو اضافی قدر بھی تسلیم نہیں کرتا ہے۔ بلکہ مکمل طور پر منفی قدر کہتا ہے۔

''سکھ دکھ کی فرقت ہے۔ ایک انسان کی زندگی پر دکھ پوری طرح حاوی ہے۔''(۳۳)

مہاتما بدھ کی طرح شوپنہائر بھی ساری دنیا اور اس کے حاصل کو دھوکا اور فریب کہتا ہے۔ چونکہ دنیا کا ہر حاصل ناپایدار ہے اس لئے دنیا میں کچھ حاصل ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس نکتے کو وہ ذرا تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

''زندگی کے مقاصد چھوٹے اور بے ثبات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی بالآخر ایک دھوکا ثابت ہوتی ہے۔ اس جھوٹی دنیا کی جھوٹی مسرتیں انسان کے دل میں عجیب و غریب آرزومندی کے چراغ جلاتی ہیں یعنی وہ دنیا میں خوش و خرم زندگی گذارنا اپنا طبعی جبلی اور قطعی حق سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن جب ان آرزوؤں کا آئینہ خانہ شکست ہو جاتا ہے تو اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔''(۳۴)

اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک عام آدمی اپنی لامتناہی آرزوؤں کی تکمیل کی شدید خواہش کرتا ہے۔ اپنے اردگرد سارے جہاں کی مسرتیں سمیٹ لینا چاہتا ہے لیکن چونکہ اس کے یہ سارے خواب شکست ہو جاتے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ جب زندگی کی بنیادی ضرورتیں اور انسان کی جبلی خواہشیں بھی نہیں پوری ہو پاتیں تو وہ ناکامی اور شکستوں کے ردِعمل کے طور پر خود زندگی اور دنیا کو مردود قرار دیتا ہے۔ انسانی آرزوؤں کی بیداری مرضی یا ارادہ کی رہینِ منت ہے۔ یہ وہ ارادہ یا مرضی ہے جو انفرادی ذہنوں میں اجنبی اور ان گنت آرزوؤں کے چراغ جلاتا ہے۔ لیکن چونکہ مرضی یا ارادہ خود بدی کا بھی خلق ہے اس لئے وہ انجانے طور پر بدی کی شمع بھی روشن کرتا ہے۔ شوپنہار جب اس زندگی اور دنیا کی بدیوں سے نجات کا راستہ ڈھونڈتا ہے تو وہ طبعی قنوطیت کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اندھی مرضی نے انسانی دماغ میں جو شمع جلائی ہے اس سے کم از کم ایک فائدہ پہنچتا ہے۔ یعنی اس کی روشنی میں ہم وہم، دہشت اور خوف کے ساتھ انسانی حیات کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ جس کے نتیجے کے طور پر انسانی مجبوری، الم اور خود فراموشی کے راز آئینہ ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم پر یہ اسرار بھی فاش ہو جاتا ہے کہ فنونِ لطیفہ، ترکِ دنیا اور خاموش دردناک ہمدردی تینوں حیات کے چیختے ہوئے بیاباں میں ایک نخلستان ہیں۔ مثلاً فنون لطیفہ کی کسی شاخ میں جب کوئی فنکار کسی فن پارے کی تخلیق کرتا ہے تو یہ تخلیقی عمل اس کے حقیقی غم اور الم

کا ایک خواب ناک ازالہ ہوتا ہے۔ اپنی مادی اور واقعی شکستوں کا غم غلط کرنے کے لئے اپنے فن کے پردے میں وہ من مانے خواب دیکھ لیتا ہے۔ یہی ایک چھوٹی سی مسرت کی پھلجڑی ہے جو زیادہ سے زیادہ فنون لطیفہ ہمیں بخش سکتی ہے۔ شاعروں کی تقدیر میں آئی ہوئی اس مسرت پر رشک کرتے ہوتے شوپنہار کہتا ہے:

''میں شاعروں کی قسمت پر رشک کرتا ہوں جو اپنی دلسوزی کے اظہار سے چند لمحوں کا عیش حاصل کر لیتے ہیں۔''(۳۵)

شوپنہائر نے بھی تاب ناک زندگی کے خواب دیکھتے ہیں۔ اور امید کی ہے کہ آئندہ ایسا زمانہ آ سکتا ہے جب دنیا کی نجات کا سامان ہو سکے۔ لیکن اگر کبھی بھی اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکا تو سارے تمدن کی بساط الٹ جائیگی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

''جب انفرادی خودکشی Will یا مرضی ایک خودغرضی دعوی کی (یعنی پر مسرت زندگی بسر کرنا) معراج سمجھ کر مردود قرار دی گئی تو یہ امید کی جاتی ہے کہ ایک نہ ایک دن سارے بنی آدم اتنے تعلیم یافتہ ہو جائیں گے کہ زندگی کے کم مایہ، پرالم اور پرفریب کردار کو سمجھ سکیں اور مرضی کی مجموعی روشنی میں زندگی کو متزلزل کر کے دنیا کو اس ابتدائی معصومیت اور جہالت کے دور میں پھینک دیں اور اس طرح دنیا کی نجات دہندگی کا منصب حاصل کر سکیں۔۔''(۳۶)

اس طرح شوپنہائر دنیا اور زندگی پر الم کی مکمل قہرمانی کا اقبال کر کے قنوطیت کا اقرار کرتا ہے۔ اور اپنی طبعی قنوطیت کو فلسفیانہ دلائل کی قبا پہناتا ہے (Von Hartman) شوپنہائر کا مشہور پرستار اور مرید غم اور خوشی دونوں کو مثبت قدرین تسلیم کرتا ہے۔ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ دنیا میں ترقی کا مادہ موجودہ ہے اور ترقی ہو بھی رہی ہے۔ تاہم وہ شوپنہائر کی قنوطیت کا دم بھرتا ہے۔ کیونکہ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا میں غم مسرت پر غالب ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جوں جوں دنیا کے اسرار انسانی اذہان پر منکشف ہوتے جاتے ہیں غم کی گرفت مسرت پر قوی تر ہوتی جاتی ہے۔ اور دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہارٹ مین اگر غم کو مسرت کے ساتھ ایک مثبت قدر تسلیم بھی کرتا ہے تو بات اپنی جگہ پر رہتی ہے کیونکہ وہ جب یہ کہتا ہے کہ دنیا میں غم کا مسرت پر غلبہ ہے تو وہ قنوطیت کا مرتکب یا موئد قرار پاتا ہے کیونکہ

''وہ نقطہ نظر قنوطی ہے جس کی رو سے دنیا میں خوشی سے زیادہ غم ہو۔''(۳۷)

حوالہ جات

1. Encyclopedia of Religion and Philosophy, P. 814.
2. GAlloway: Philosophy of Religion, P. 513.
3. Ward: the Realm of Religion, P. 320.
4. Sully: Pessimism, P. 9.
5. Ibid, P. 42.
6. Ibid, P. 53.
7. Philibus: the Nineth Book of the Republic, P. 91.
8. Radha Krishnan: Indian Philosophy, P. 114.
9. Encyclopedia of Religions Philosophy, Vol. 7, P. 815.
10. Hopkins: the Religions of India, P. 356.
11. Myers: History of Past Ethics, P. 97.
12. Encyclopedia of Religions Philosophy, P. 810 - 812.
13. Ibid.
14. Myers: Ibid, 169, op. cit. p.
15. Ibid, P. 103.
16. Ibid, P. 52.
17. Bloomfield: Religion of Vedas, P. 264.
18. O. Brooks: Northern India, P. 160.
19. Myers: Op., Cit.
20. Ibid.
21. Macdonell: History of Sanskrit Literature, P. 9 - 11.
22. Bloomfield: Religion of Vedas, P. 264.
23. Oldenberg: Badha, Hislife His Doctrine, His Order, Eng. Tran, P. 40.

24. Hopkins: The Religions of India, P, 352.
25. Oldenberg op. cit., P. 201.
26. James Sully's "Pessimism" P. 73.
27. Sully's Pessimism, P. 7.
28. Sully's Pessimism, P. 9.
29. The Realms of Ends by Ward, P. 318.
30. Sully's Pessimism, P. 21.
31. Ibid.
32. The Realm of Ends by Ward, P. 320.
33. Sully's Pessimism, P. 70.
34. World as will as idea by Schoperhauor, P. 210 - 218.
35. World as will and Idea by Schopenhauor, P. 226.
36. Please see the first pages of the chapter.
37. World as will and Idea by Schopenhauor. Quoted by Galloway: Principles of Religious Developments, P. 324, (2nd Edn)

☆☆☆

لطیف الزّماں خاں

خطوط بنام اقبال رشید صدّیقی صاحب

(۱)

پنج شنبہ ۱۴ر جون ۲۰۰۱ء

سی/۱۴۹، غالب نما، حالی روڈ،
گل گشت، ملتان۔ ۶۰۷۰۰

مصدرِ لطف و کرم، السّلام علیکم

آج آپ کا ۷ر جون کا محبت نامہ ملا۔ ماہ نامہ سورج لاہور کا مارچ کا شمارہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ محترم خلیل الرّحمٰن داؤدی صاحب کا محاکمہ بطورِ خاص توجّہ طلب ہے۔ دیوانِ غالب نسخۂ لاہور جس طرح چوری ہوا یا کیا گیا اس کے مرتب کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا لیکن جس طرح سیّد صاب نے رشید صاحب کو اپنی ''کائنات'' کہا اور اپنی نالائقی پر پردہ ڈالنے کے لیے رشید صاحب کو آڑ بنایا اُسے کسی طرح بھی نہیں سراہا جا سکتا۔ رشید صاحب کو اگر شعر یاد نہیں رہتے تھے تو کیا ہوا اشعار کا مفہوم جس طرح اُن کے ذہن میں محفوظ رہتا تھا میں نے اپنی چھہتّر سالہ زندگی میں دوسری مثال دیکھی نہ سنی، نہ پڑھی۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں ہزار ہا اشعار ازبر ہیں، دیوان کے دیوان یاد ہیں مگر وہ معنی و مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ داؤدی صاحب ملک میں سب سے بڑے مخطوطہ شناس ضرور ہیں مگر سیّد صاحب کی نالائقی کو ظاہر کرنے کے لیے انہیں رشید صاحب کا حوالہ دیتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ وہ سیّد صاحب کو مطعون کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کریں مگر رشید صاحب کے بارے میں ان کا علم وہ نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھا۔

رشید صاحب کے بارے میں جتنی تحریریں میں نے جمع کی اور پڑھی ہیں اَب تک مجھے کوئی ایسی تحریر نہیں ملی جسے پڑھ کر میں یہ کہہ سکوں کہ ان کی ''شخصیت'' کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ میں کسی کی نیّت اور خلوص پر شبہ نہیں کرتا لیکن نہ جانے کیوں یہ خیال میرے دل سے کبھی نہیں نکلا کہ رشید صاحب کی شخصیت کو اب تک کوئی سمیٹ نہیں سکا۔ اوّل تو ان کی تمام تحریریں ہر شخص کی دسترس میں نہیں ہیں دوم یہ کہ اُن کی تحریروں میں پوشیدہ انسان سے محبت، انسانیت پر اعتبار اور ایک برگزیدہ انسان کی صفات کو تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے۔ آپ نے سو فی صد درست لکھا کہ جس طرح ہمارے رشید صاحب نے اقبال سے کہا کہ جو کچھ آپ جانتے ہیں وہ بتاتے نہیں ہیں رشید صاحب بھی کھل کر وہ بات نہیں بتاتے جو وہ جانتے تھے۔ جس طرح ایک بڑا شاعر شعر کہتا ہے اور ناقدین اُس کی تشریح کرتے ہیں، زمانہ آئے گا جب

ہمارے رشید صاحب کی تحریروں کا مطالعہ اس طور پر کیا جائے گا کہ کیا کچھ ان میں پوشیدہ ہے۔

صرف علی گڑھ ہی نہیں مسلمانوں اور بالخصوص تقسیمِ ہند سے قبل کے مسلمانوں اور تقسیمِ ہند کے بعد مسلمانانِ ہند پر کیا بیت گئی ہے، مادرِ درس گاہ پر کیسا کیسا پیغمبری وقت آیا ہے اس کا بیان جس دل سوزی سے اُن کی تحریروں میں آیا ہے ___ مجھے تو دوسری مثال ملی نہیں۔

عبدالحق صاحب کے کارناموں سے انکار نہیں اُردُو زبان کے مخطوطات کی تلاش، اُن پر مقدمات اور اُردُو سے اُن کا عشق مثالی ہے۔ اُنہوں نے اُردُو کی جڑوں کو تلاش کیا۔ سیّد عبداللہ صاحب نے بہت لکھا لیکن زیادہ تر طالب علموں کے لیے۔ مالک رام صاحب نے غالب پر لکھا اور بہت اچھّا لکھا۔ صرف عبدالصمد کے بارے میں ان کے دلائل سے اتّفاق ممکن نہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب بہت بڑے محقق تھے، لکھنے میں نڈر اور بے باک تھے۔ عرشی صاحب کا کارنامہ یہ کہ انہوں نے دیوانِ غالب کی بہترین ایڈیٹنگ کی، غالب کے خطوط جو نوّاب رام پور کے نام تھے انہیں شائع کیا۔ بلاشبہ ان تمام حضرات کے کارنامے قابلِ تعریف ہیں اور رہیں گے مگر بات جب رشید صاحب کی ہوگی تو پھر بہت سی باتوں پر غور کیا جائے گا۔

ایک دن ظہیر صدّیقی صاحب سے دورانِ گفتگو میں نے کہا کہ کاش میں رشید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوسکوں اور اپنے اُس خوف اور ہیبت کا اظہار کیا۔ وہ ہنسے۔ کہنے لگے ''تم نے شفقت، علم اور محبت کو مجسّم کبھی نہ دیکھا ہوگا۔'' پھر وہ ایک دن مجھے رشید صاحب کے پاس لے گئے۔ میرے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ ظہیر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مجھے رشید صاحب کی خدمت میں پیش کرنا نیکی میں شمار ہوگا۔ سرسیّد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب اللہ پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لائے ہو تو کہوں گا حالی سے مسدّس لکھوالایا ہوں۔ میں ایک گنہ گار انسان ہوں اگر میری بخشش ہوئی تو صرف اس لیے ہوگی کہ میں اپنے رشید صاحب کی تحریریں شائع کرا سکا۔

میں ایک مرتبہ علی گڑھ میں تھا۔ اتنی ہمّت خود میں نہ پاتا تھا کہ رشید صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھ آؤں۔ فصیح صاحب لے گئے میں نے قبر اور اُس کے اردگرد پڑے ہوئے پتّوں کو صاف کیا اور ایسا کرتے ہوئے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں شاید اپنے حقیقی والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی موت پر اتنا نہیں رویا تھا۔ وہ صرف میرے ماں باپ تھے مگر رشید صاحب تو اُن سب طالب علموں کے باپ تھے جو اُن کے زمانے میں علی گڑھ میں تعلیم پاتے رہے۔ مجھے نہیں معلوم وہ کس طرح مجھے قاضی عبدالستار صاحب کے ہاں لے گئے اور شام تک کسی طرح آنسو بند نہ ہوئے۔ آج بھی جب یہ سطور لکھ رہا ہوں تو آنسو بند نہیں ہوتے۔ جگر صاحب کا ایک شعر کبھی پڑھا تھا مگر معنی اب سمجھ میں آئے ہیں:

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

شعر کا مفہوم و مطلب تو سمجھ میں اُسی وقت آتا ہے جب وہ پڑھنے والے پر بیت جاتا ہے۔ مجھ پر یہ شعر بیت گیا ہے۔

آپ نے جس محبت سے میرے بارے میں لکھا اس کے لیے شکریے کا لفظ بے معنی ہوگیا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے، آمین۔ میں کچھ نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ آپ میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اتنی مہلت عطا فرمائے کہ میں رشید صاحب کی تمام تحریریں لفظ لفظ کتابی شکل میں محفوظ کر سکوں تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں یہ جان سکیں کہ سرسیّد نے قوم کے لیے جو کچھ کیا وہ اہم سہی لیکن اُس ادارے سے عشق، اس کی عظمت اور اس کے کارنامے بیان کرنے والے رشید صاحب سے پہلے یا اُن کے بعد کوئی نہ ہوا۔

ڈاکٹر محمد علی صدّیقی نے ایک مرتبہ مجھے اپنے ایک خط میں لکھا کہ میزانِ نثر کی جلدیں شائع ہونے سے کئی مزاح نگاروں کے قد و قامت اور علم کا حال عیاں ہوگیا۔ چارپائی کو یوسفی صاحب نے موضوع بنایا لیکن چارپائی کے عنوان سے رشید صاحب نے جو مضمون لکھا وہ بے مثل ہے۔ میں نے انہیں اس سلسلے میں کئی خط لکھے افسوس کہ اُن کے عکس میں نے نہیں رکھے ورنہ آپ کو بھیجتا۔ محمد علی صاحب نے ایسے تمام خطوط جو میں نے رشید صاحب کے حوالے سے لکھے ہیں الگ رکھ لیے ہیں۔ دسمبر میں آؤں گا اور اُن سے درخواست کروں گا کہ نقول فراہم کر دیں۔

مخلص

لطیف الزّماں خاں

(۲)

پنج شنبہ ۲۶/ جولائی ۲۰۰۱ء

سی/ ۱۴۹، غالب نما، حالی روڈ،
گل گشت، ملتان۔ ۶۰۷۰۰

گرامی قدر، تسلیمات

آج آپ کا ۲۳/ جولائی کا نوازش نامہ، میزانِ نثر جلد دوم پر مظہر عارف صاحب کا تبصرہ اور محترمہ ساوتری دیوی گپتا رضا صاحبہ کا مضمون ''گپتا رضا سے ملیے'' ملا۔ ان سب کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ کی علالت سے پریشان ہوا۔ دعا ہے کہ پروردگارِ عالم اپنے حبیب کے صدقے آپ کو صحتِ کُلّی عطا فرمائے، آمین۔ ایک آپ ہی تو ہیں جن سے رشید صاحب کی علی گڑھ کی اور والدہ صاحبہ کی باتیں کر لیتا ہوں۔

آپ کے دوست جعفری صاحب نے بہت اچھّا کیا کہ محترمہ ساوتری دیوی صاحبہ کے مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ڈان میں شائع کرایا۔ میں یہ تراشہ بمبئی بھیج دوں گا اور آپ کی جانب سے دعا بھی لکھ دوں گا۔ رضا صاحب انتہائی منکسر المزاج، خاموشی سے لوگوں کی مدد کرنے والے، علم دوست،

غالبؔ پرست اور دوست نواز انسان تھے، میں اپنی یادوں کو جمع کر رہا ہوں جلد ہی اُن کا خاکہ لکھوں گا۔

دیکھ کر سانوری صورت کسی متوارے کی
ہوں مسلماں، مگر جے بولتا ہوں کالی کی

میری اور اُن کی ملاقات غالب کے توسّط سے ہوئی اور پھر یہ ایسی رفاقت میں تبدیل ہوگئی جو مثالی تھی۔ انہوں نے جب دیوانِ غالب تاریخی ترتیب سے شائع کیا تھا تو اُسے میرے نام معنون کیا تھا اور اُن کا مجھ پر یہ کرم کراچی اور لاہور کے کئی حضرات کے لیے باعثِ حسد ہوا مگر یہ ایک تاریخی واقعہ تھا اور اب یہ غالب کے حوالے سے اَدَب کی تاریخ ہی کا حصّہ ہے۔ انہوں نے ایک کتاب مسعود حسین خاں صاحب کے نام بھی معنون کی تھی۔

ایک ماہ ہونے کو آیا ابھی تک حوری نے اطّلاع نہیں دی کہ میزانِ نثر جلد پنجم کب تک شائع ہوگی۔ اصولاً ۳۱ر جولائی تک کتاب آجانی چاہیے۔ کسی وقت ٹیلی فون سے تاکید کر دیجیے۔

برادرم مہرالٰہی صاحب اپنے بیٹے کی شادی کر رہے ہیں اور مکان میں بالائی منزل کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ۲۴ر جولائی کو یہاں دن کے دو بجے شدید بارش ہوئی ایسی تیز بارش یہاں شاذ ہی ہوتی ہے آج کل یہاں چونسہ بکثرت آیا ہوا ہے مگر گراں ہے۔

دونوں بیٹیاں آئی ہوئی ہیں گھر میں رونق اور چہل پہل ہے۔ بڑی بیٹی ڈاکٹر مہ جبیں ۳۱ر جولائی کو بذریعہ ٹرین جائے گی اور لالہ رخ ۶ر اگست کو بذریعہ ہوائی جہاز۔ پھر تنہائی اور سنّاٹا آجائے گا۔ زندگی ایسی ہی ہے۔ کچھ نہ کچھ کام کرتا رہتا ہوں تو دل لگا رہتا ہے۔

مخلص
لطیف الزّماں خاں

☆☆☆

محمد اشرف کمال

مجلّہ افکار کے اداریے

صہبا لکھنوی نے جب بھوپال سے ''افکار'' جاری کیا تھا تو ان کے پیشِ نظر ایک واضح مقصد اور نصب العین تھا۔ اس مقصد کا سراغ افکار کے پہلے شمارے مطبوعہ مارچ ۱۹۴۶ء کے اداریے سے لگایا جاسکتا ہے جو کہ انھوں نے آغازِ کار کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔ افکار کی اشاعت کی وجہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''افکار اردو ادب کا ایک بلند اور ارتقائی معیار پیش کرے گا اور جلبِ منفعت کے اس جنون سے جو ادب کے اکثر مخلصین کو تجارت کی پستیوں میں کھینچ لاتا ہے مردانہ اور خوددارانہ بے اعتنائی کا سلوک کرے گا۔''[۱]

صہبا لکھنوی بھوپال سے کراچی آنے کے بعد کچھ عرصہ فارغ رہے لیکن آخر کار وہ جون ۱۹۵۱ء میں افکار کا پہلا شمارہ جاری کرنے میں کامیاب ہوگئے جو کہ خاص نمبر تھا اور یہ صہبا صاحب کی ایک بڑی کامیابی کا آغاز تھا۔ وہ مختلف رسائل کی روشنی میں افکار کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''افکار بھوپال سے کراچی منتقل ہونے کے بعد افکار کا یہ پہلا شمارہ اور تیسرا خاص نمبر ہیجو جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد نومبر ۱۹۴۵ء میں افکار کا ڈیکلریشن حاصل کیا گیا اور بھوپال جیسی محدود ریاست سے جہاں اس سے پہلے کسی ادبی رسالے نے سال چھ ماہ سے زیادہ زندگی نہیں پائی افکار پورے پانچ سال تک نکلتا رہا۔ پانچ سال بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں لیکن رفتارِ ادب کا جائزہ لینا اور زبان و ادب کے نئے تقاضے، ادب کی نئی راہیں اور صحت مند رجحانات کے نئے موڑ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔[۲]

صہبا لکھنوی نے افکار کے اجراء سے پاکستان اور خاص طور پر کراچی کی ادبی فضا میں ایک تموج اور تحرک پیدا کیا۔ رسائل کسی بھی معاشرے کی ادبی رفتار اور تہذیبی و ثقافتی صورت حال کی ترجمانی کا ایک اہم وسیلہ ہوتے ہیں۔ جولائی ۱۹۵۱ء کے شمارے کے اشاریے میں صہبا لکھنوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''افکار نے اپنے چھٹے سال کی زندگی کا آغاز تیسرے خاص نمبر سے کر کے ملک کے علمی و ادبی حلقوں کو پھر ایک بار چونکا دیا۔ کراچی کی سوئی سوئی سی ادبی فضا میں بھی حرکت و عملکے آثار پیدا ہوگئے اور خوشی کا مقام ہے کہ افکار کے خاص نمبر کو دیکھ کر بہت سے مشہور ادیب و شاعر جو عرصہ سے خاموش تھے پھر لکھنے کے

لیے آمادہ نظر آنے لگے۔''[۳]

تقسیم ہند کے بعد پاکستان، ایک نوزائدہ ملک اپنے قیام اور مہاجرین کی بے سروسامانی کی صورت میں آمد کی وجہ سے بہت سے مسائل اور پریشانیوں سے دوچار تھا، ملک وقوم ایک مشکل اور پُر آزمائش دور سے گزر رہے تھے ایسے میں ''افکار'' کے اداریوں میں بھی اس قومی وملکی صورت حال کو زیر بحث لایا گیا۔ صہبا لکھنوی افکار شمارہ اگست ۱۹۵۱ء کے اشاریے میں لکھتے ہیں:

''آزادی کا یہ راستہ جو ہم نے چار سال میں طے کیا بڑا صبر آزما اور دشوار گزار تھا راہ میں ہمیں ہزاروں لاکھوں خانماں برباد، شکستہ حال اور محروم ومجبور انسان ملے مگر ہم نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ان کے ساتھ چلتے رہے چلتے رہے اور یہ قافلہ سچی آزادی اور خوشحالی کی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ بڑھتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ اس میں یقین واعتماد پیدا ہوتا گیا۔ یہ زندہ انسانوں کا قافلہ تھا جس کی رفتار وگفتار نے زندہ ادب کی تخلیق کی اور یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا ادب بے جان اور فرسودہ نہیں اس میں حرکت بھی ہے عمل بھی۔''[۴]

صہبا لکھنوی کے اشاریے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے تھے اور ادب اور تنقید ادب کی افادیت سے بہرہ ور تھے۔ افکار کے شمارہ نومبر ۱۹۵۷ء کے اشاریے میں لکھتے ہیں:

''ادب کے ان گنت مسائل میں تنقید کا مسئلہ بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے ادھر دوچار سال سے ہمارے چند بڑے اور عظیم نقادوں کی پراسرار خاموشی اور تنقیدی مسائل سے عدم توجہی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بلا امتیاز ہر شخص تنقیدیں لکھنے لگا ہے اور ان تحریروں کا عام انداز تنقید سے زیادہ تنقیص اور ذاتی رنجشوں کا آئینہ دار ہے اور اس طرح تنقیدی ادب میں ایک نہایت خطرناک رجحان پرورش پا رہا ہے۔''[۵]

''الشجاع'' اور ''مسلم نیوز انٹرنیشنل'' کے بند ہوجانے پر وہ ادبی رسائل کے مستقبل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ملک میں کتنے اچھے اور معیاری رسالے زندہ رہ گئے ہیں انگلیوں پر گن لیجئے اور بتائیے کہ اگر یہ چند رسالے بھی اپنی موت آپ مر گئے تو علمی، فکری اور ادبی اقدار کا ارتقاء اور نئی نسل کی ذہنی تربیت کیا صرف آمدنی اور پیداوار اور زراعتی ترقی پر تمام تر توجہ صرف کرنے سے ممکن ہوگی اس سے زیادہ کچھ عرض کرنے کی مجھ میں سکت نہیں۔''[۶]

ان کے اداریوں میں جگہ جگہ ادب اور ادیبوں کے حوالے سے لوگوں کی ناقدری کا رونا رویا

گیا ہے اور ان نقادوں کی مذمت کی گئی ہے جو خواہ مخواہ چونکانے کے لیے الٹی سیدھی تنقیدیں کرتے ہیں۔ افکار مجاز نمبر ۱۹۵۶ء کے اشاریے میں لکھتے ہیں:

''ایسے لوگوں سے گلہ بھی نہیں کیونکہ ان کی سوچ اور ان کی اڑان صرف سات سمندر پار کے نقادوں اور ادیبوں تک ہے۔ قول ان کا سند ہے جو مشرقی تمدن، مشرقی روایت اور مشرقی ادب کی رفتار کار پر نظر رکھتے ہیں''۔[۷]

انھوں نے اپنے اداریوں میں زمانے کی بدلتی ہوئی ادبی ضروریات اور رجحانات ومیلانات کا مطالعہ باقاعدگی سے شائع کیا ہے اور وقت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ صہبا لکھنوی لکھتے ہیں:

''چاند کی تسخیر سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی موجودہ ترقی تک زندگی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوچکی ہے۔ انسانی خواہشات اور ضروریات بھی اسی رفتار سے بڑھتی جارہی ہیں دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے اس عالم میں ذرا ادبی افق کو تلاش کیجیے، اگر ادبی افق موجود ہے تو اس میں روشنی اور تابندگی کیوں نہیں ہے۔''[۸]

صہبا لکھنوی کو سب سے زیادہ فکر افکار کے جاری رہنے اور اس کے تسلسل اور باقاعدگی کی تھی وہ دوسرے کئی ادبی رسائل کا حال دیکھ چکے تھے کہ مدیر کے فوت ہوتے ہی رسالہ بھی منظر عام سے غائب ہوگیا، لکھتے ہیں:

''مجھے اپنے اور ''افکار'' کے مستقبل کا علم ہے میرے بعد افکار زندہ نہیں رہ سکے گا یہ سچ ہے اس میں ذرا برابر مبالغہ نہیں ہے ہر مدیر کے ساتھ اس کے رسالے کی موت نوشتۂ تقدیر ہے اور بس!۔''[۹]

ان کے اداریوں کی حیثیت ادبی ہی نہیں بلکہ تاریخی حوالے سے بھی ان کی اہمیت ہے انھوں نے گزرتے ہوئے شب وروز کی روداد بھی اداریوں میں رقم کردی ہے۔ اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ لاہور کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''رباط کے بعد لاہور کے دوسرے اور اپنی نوعیت کی پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس کے تاریخ ساز فیصلوں سے اس امر کا ثبوت بھی فراہم ہوا ہے کہ اسلامی ملکوں کو جبر واستبداد، استحصالی نظام اور استعمار پرست طاقتوں کے غیر منصفانہ رویے نے ایسی طاقت بنا دیا ہے جو ناقابل شکست ہے''۔[۱۰]

صہبا لکھنوی کے اداریے زیادہ تر تہذیبی وثقافتی پس منظر میں قومی وملکی پیش منظر کو اجاگر کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں جن میں قومی شعور اور قومی زبان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ صہبا لکھنوی افکار کے انقلاب نمبر میں لکھتے ہیں:

''پاکستان ایک وحدت ہے جو رنگا رنگ تہذیبوں اور

ثقافتوں سے عبارت ہے ۔ بنگال، سندھ، بلوچستان، ، پنجاب اور سرحد کی زبانیں اور تہذیبیں اس ملت کا سرمایہ اور اساسیہیں جن کے بغیر پاکستان کا تصور بھی نہیں۔'' [۱۱]

وہ اردو زبان کی اہمیت وضرورت سے بخوبی واقف تھے، اردو زبان کی حمایت میں لکھتے ہیں:

''ان آزادی کے بیس سال بعد اچانک یہ عقدہ کھلا کہ اردو کو نہ صرف یہ کہ اس کا جائز مقام نہیں دیا جارہا ہے بلکہ اس کا چہرہ مسخ کرنے اور اس کی بنیادی ساخت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور زبان کو جب ایک ملک گیر زبان کی حیثیت حاصل ہے تو اس کو تسلیم نہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے آفتاب نیم روز کی روشنی سے انکار کرنا۔'' [۱۲]

صہبا لکھنوی نے جہاں ادبی اور علمی حوالے سے اداریے لکھے ہیں وہاں انھوں نے تعلیم کی جانب بھی خصوصی توجہ کی ہے اور اربابِ اقتدار کو تعلیمی اصلاحات کی ضرورت واہمیت باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''پاکستان کی اساس سچ پوچھیے تو یہی نونہال ہیں جن کی ابتدائی تعلیم پر اب تک کوئی توجہ نہیں دی جاسکی اور وہ گزشتہ بیس سال سے انگلستان کے نصاب سے خارج شدہ کتابیں پڑھنے پر مجبور ہیں''۔ [۱۳]

صہبا لکھنوی کے اداریے قارئین کے لیے سوچ اور غور وفکر کے نئے در وا کرنے کا سبب بنے ہیں وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانا جانتے تھے اور بات کہنے کے سلیقے سے بھی خوب واقف تھے۔ افکار کے جوبلی نمبر میں لکھتے ہیں:

''مجھے نہ اپنے مستقبل کی فکر نے کبھی ستایا نہ ماضی کے عبرت ناک دور نے کبھی دل گرفتہ کیا۔ میرا مقدر تو ادبی دیوانوں کے گروہ کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے اس لیے مجھے دن اور رات کے ہر لمحہ نے صرف اس لیے آسودۂ خواب نہ ہونے دیا کہ میرے لیے ہر ماہ پابندی کے ساتھ ''افکار'' کو شائع کرنا ضروری تھا۔ اور اپنے پڑھنے والوں کے لیے بہتر سے بہتر اور دلچسپ سے دلچسپ مواد پیش کرنا۔'' [۱۴]

تمام ادبی رسائل کی روایت یہ رہی ہے کہ اداریہ لکھنا مدیر ہی کا فریضہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ مدیر رسالے کی پالیسی اور رجحان سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے اس لیے وہ زیادہ بہتر انداز میں اداریہ لکھ سکتا ہے۔ لیکن جب ہم ماہنامہ ''افکار'' پہ نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کے اداریہ نویسوں میں مختلف اوقات میں مختلف نام سامنے آتے رہے ہیں۔ اس جدت اور انفرادیت کا سہرا صہبا لکھنوی کے سر ہے۔ صہبا لکھنوی لکھتے ہیں:

''جب کوئی تیس سال تک راقم الحروف اداریے لکھتے لکھتے تھک گیا تو میں نے اپنے اداریے کو مہمان مدیروں کیحوالے کر دیا یہ تجربہ اردو ادب میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا۔ اس لیے بے حد کامیاب ہوا''۔ [۱۵]

صہبا لکھنوی نے افکار کے اداریوں میں ایک میکانیک اور بے کیفی پیدا نہیں دی اور مختلف شخصیات سے افکار کے اداریے لکھوائے، یوں ایک خوبصورتی بھی پیدا ہوگئی اور فکر ونظر کے حوالے سے جدت اور انفرادیت بھی۔ صہبا لکھنوی نے افکار کے اداریے مہمان مدیروں کے سپرد کر کے ادب کی خدمت کا ایک اور نیا راستہ نکالا۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''افکار میں تنقیدی مضامین کی کمی قدرے کھٹکتی ہے لیکن صہبا صاحب نے اس کمی کو مہمان اداریوں سے پورا کرنے کی سعی کی ہے۔ ادبی پرچے کا اداریہ مدیر کے فکر ونظر کا نقیب اور ادب کی تحریکوں کا رفتار پیما ہوتا ہے۔ ادبی اداریہ مستقبل کے رجحان کی طرف اشارہ نمائی بھی کرتا ہے۔ افکار میں صہبا صاحب نے یہ کام اہل ادب کو سونپ دیا ہو کہ وہ تازہ مسائل پر گہری اور پوری نظر ڈالیں اور اپنے تصورات کو افکار کے قارئین کی کھلی کچہری میں پیش کر دیں۔ ۱۹۸۸ء کے دوران ممتاز نقاد محمد علی صدیقی نے متنوع موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ ایک مہمان اداریے میں انھوں نے انشائیے کو کثرت تعبیر کا افسانہ شمار کیا اور اس معنی خیز حقیقت کی طرف اشارہ بھی کیا کہ انشائیہ اور متوسط طبقے میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اور آخر میں یہ فیصلہ بھی دیا کہ مضمون کی اصطلاح سے واقعتاً وہ مفہوم نہیں نکلتا جو انشائیے سے نکلتا ہے''۔ [۱۶]

افکار کے اداریہ نگاروں میں ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر فہیم اعظمی، محمد علی صدیقی، احمد ہمدانی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، قمر عباس ندیم، اکرام بریلوی، حسن عابدی، قیصر تمکین انجم اعظمی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان مہمان مدیروں نے افکار کی پالیسی کے تحت اداریے تحریر کیے اور ادب وصحافت کی نئی منزلوں کی جستجو میں افکار کے مقاصد اور کوششوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ محمد علی صدیقی افکار کے اداریے میں 'وقت عظمت اور سپاٹ ڈھلوانیں' کے عنوان سے علم وادب کے منصب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''وہ علم ہی کیا جو ایک دور کی تفہیم کا ذریعہ ہو اور وہ وقت ہی کیا جس کے آئنے میں گزشتگاں اور آئندگاں کے چہرے بیک وقت نظر نہ آتے ہوں۔ بڑے اور عظیم ادیب اپنی ساری کوششیں تسخیر وقت پر ہی مرکوز کرتے آئے ہیں۔ ان کی ساری حکمت وقت سے نبرد آزمائیمیں پوشیدہ تھی ۔ پوشیدہ رہی اور پوشیدہ ہے۔'' [۱۷]

محمد علی صدیقی نے اپنے اداریوں میں ادب میں عصری صداقتوں کے اظہار اور سچے جذبات کی ترجمانی پر زور دیا ہے اور ادب برائے عوام کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ قارئین کی آمریت کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''ادب اور فنون کا تعلق بہر صورت عوام سے ہوتا ہے، عوام کا تعلق سماج سے اور پھر سماجی ارتقا کی منطق کے تحت، ہر سماج ایک مخصوص نظامِ حکومت سے ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں علم کا پھیلاؤ علم کی سمتوں میں نہیں ہوسکا، بلکہ وہ تعصّبات کو زیادہ عقلی بنانے کے لیے ہوا ہے۔'' [۱۸]

ایک اور اداریے میں روشن خیالی بے وقت کی راگنی کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''روشن خیالی اس وقت بھی اور آج بھی انسانی سماج اور انسانی علم کے مابین ہر قسم کے تضادات مٹانے کا نام ہے''۔ [۱۹]

محمد علی صدیقی کے اداریوں میں اعلیٰ ادب اور انسانی قدروں کی پاسداری اور ادب کے روشن پہلوؤں کو سامنے لانے کا عمل ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''روشن خیالی کی تحریک تعقل پسندی کو پسِ پشت ڈالنے کی بجائے اسے اپنا ہمرکاب بناتی ہے۔'' [۲۰]

محمد علی صدیقی ان مہمان اداریوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہاں قارئین سے براہ راست مکالمہ کے پیشِ نظر سنجیدہ مسائل اور معاملات کو خاصی بے تکلفی کہنے کی صورت پیدا ہوئی جن حضرات نے مضمون نویسی میں بھی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا ہے وہ میرے خیال میں اشاریہ نویسی ہی کے مرد میدان ہیں۔'' [۲۱]

افکار کے ایک اور اہم مہمان مدیر ڈاکٹر فہیم اعظمی ہیں جنھوں نے اپنے اداریوں سے اردو ادب میں نئی راہوں کی تلاش اور نئے زاویوں کو ابھارنے کی سعی کی ہے ان کا ایک اداریہ ملاحظہ کیجیے جس کا عنوان 'ادب اور آکسیجن کی معتدل سپلائی' ہے:

''ادیب کا اظہار ہمیشہ خلوص پر مبنی ہوتا ہے۔ اپنے ملک وقوم کی محبت اور ہم مکینوں کی اخوت پر۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی تحریر وتقریر میں تنقیص کی طرف زیادہ رجوع ہو مگر اس کے الفاظ کے پیچھے ایک صحت مندانہ رویہ کارفرما ہوتا ہے اور اگر ایسا ہے تو کوڈ اور سنسر کی کوئی ضرورت نہیں۔'' [۲۲]

ڈاکٹر فہیم اعظمی تحریر وتخلیق کے افادی پہلو کے قائل ہیں ان کے نزدیک ہر تحریر نئی سوچ اور نیا زاویۂ اظہار لیے ہوتی ہے اور ہمیں اس کے تنقیدی پہلو کی افادیت سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر

انور سدید لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر فہیم اعظمی کے اداریے تیکھے، چوٹیلے اور کٹیلے ہیں۔ مثلاً انھوں نے بڑے شہروں کے ادبی حلقوں کا سوال اٹھایا ہے تو اس منافرت کو بھی آشکار کیا ہے جو ان حلقوں کی بدولت پروان چڑھ رہی ہے اور اب ادب کے لیے آکاس بیل ثابت ہو رہی ہے۔ سنھوں نے ''صرف شدہ'' ادیبوں کے مسئلے میں ان لوگوں کو موضوع بنایا جو عرصے سے مینو پاژیت کا شکار ہیں اور خود اپنے خیالات اور لفظوں کی جگالی کر رہے ہیں۔ [۲۳]

پروفیسر مجتبیٰ حسین کے اداریوں میں قومی معاملات، تہذیب وثقافت اور قومی مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے انھوں نے پاکستان میں تعلیمی صورتحال، ادبی رفتار اور مختلف ماہناموں کے حوالے سے اردو میں تخلیقی رجحان پر قلم اٹھایا ہے اردو زبان کے حوالے سے ایک اداریے میں 'نیم صداقتیں، قومی انحطاط اور اردو کا مسئلہ' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اردو کو گردن زدنی قرار دینے کے لیے اردو کے لسانی ارتقاء کو پڑھے اور سمجھے بغیر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اردو سرکاری، درباری زبان ہے گویا دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں اس دور سے کبھی گزری ہی نہیں اور یہ تاریخی جرم محض اردو سے سرزد ہوا ہے، دیگر زبانیں عوامی تھیں اور عوامی ہیں اور وہ لوک ادب سے اب تک آگے نہیں بڑھی ہیں۔'' [۲۴]

پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اپنے اداریوں میں شعر وادب کی راہیں متعین کرنے، تعمیری ادب کی پرورش اور فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین کے بارے میں صہبا لکھنوی لکھتے ہیں:

''میرے مہمان مدیروں میں پروفیسر مجتبیٰ حسین بھی بخوشی شامل ہوگئے اور ایک سے ایک اچھا اداریہ اپنے منفرد اسلوب میں لکھ کر ادبی اقدار اور نئے تصورات کو فروغ دیا۔ چند ایک عنوانات ہی آپ کو میرے قول کی صداقت کا یقین دلا دیں گے۔

۱۔ روایت۔ انسان کا ثقافتی حافظہ (مطبوعہ افکار شمارہ مارچ ۱۹۸۱ء
۲۔ شعر، مدرسہ اور نئی نسل کا مستقبل ؍ ؍ جولائی ۱۹۸۳ء
۳۔ ادب، ابلاغ اور آدمی ؍ مارچ ۱۹۸۵ء
۴۔ دانشورو تم اندھیرا لے کر آرہے ہو یا روشنی ؍ فروری ۱۹۸۶ء
۵۔ ادبی تسلسل، تخلیقی عمل اور اردو کے ماہنامے ؍ دسمبر ۱۹۸۷ء
۶۔ نیم صداقتیں، قومی انحطاط اور اردو ؍ مارچ ۱۹۸۸ء [۲۵]

اکرام بریلوی کے اداریوں میں پاکستانی کلچر کے مستند حوالے اور ثقافت کا توانا شعور ملتا ہے۔ ان کے اداریوں میں قومی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھنے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اپنے ایک اداریے میں ''ثقافتی موزیک'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''قیام پاکستان کے بعد ہمیں اپنی سوچ کا انداز نئے ملکی تقاضوں کے مطابق بدلنا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ نئی سوچ، ذہن اور جذبے میں توازن پیدا کرنے سے رونما ہوتیہے۔ اس کے حصول کے لیے بہت فرسودہ روایات، سماجی قیود Social Taboos اور ذاتی انا کے بت توڑنا ہوں گے۔''

[۲۶]

اکرام بریلوی اپنے ایک اور اداریے میں ثقافت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ثقافت کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ ہمارے مذہبی اور روحانی عقائد، نظریاتی فکر، لسانی وابستگی اور تاریخ کے عمل سے ہے، عرف عام میں ثقافت ان ہی تین عناصر سے نم ونمود حاصل کرتی ہے۔''[۲۷]

ڈاکٹر حنیف فوق نے بھی ایک عرصہ تک افکار کے مہمان مدیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دی ہیں اور صہبا لکھنوی کے بعد جناب ڈاکٹر حنیف فوق ہی افکار کی ادارت ونگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق کے اداریے علمی وادبی اور تاریخی اسلوب لیے ہوئے ہیں ان کے اداریوں میں ادب کے عصری افق کے ساتھ ساتھ آفاقی پیش منظر کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے ایک اداریے میں ادبی صورت حال، نئی نسل اور تیسری دنیا کے عنوان سے رقم طراز ہیں:

''ادب میں ہمیشہ عصری اور آفاقی دونوں صداقتیں ایک دوسرے سے نا قابل تقسیم حد تک وابستہ ہوکر ایک مجموعی کُل کی تشکیل کرتی ہیں تو ادب کے بڑے نمونے وجود میں آتے ہیں۔''[۲۸]

افکار کے مہمان مدیروں اور ان کے اداریوں کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''مجتبیٰ حسین، حسن عابدی، حنیف فوق، اکرام بریلوی کے اداریے بھی سوال کو سیدھے اور دوٹوک انداز میں ابھارتے ہیں اور خیال کی متعدد پرتوں کو کروٹ دے دیتے ہیں۔ ان سوالات نے ادبی معاشرے کو اپنی زبوں حالی کا احساس تو دلایا ہے لیکن شاید اس زبوں حالی کے استدراک کی طرف کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا گیا''۔[۲۹]

انجم اعظمی نے ''افکار'' کے لیے لکھے گئے اپنے اداریوں میں ادب کے ساتھ ساتھ ادیب کو بھی موضوع بحث رکھا ہے اور ادب کے حوالے سے ادیب کی تخلیقی نہج، ادبی وابستگیوں اور مقام ومنصب سے

بحث کی ہے۔ اپنے ایک اداریے ''ادب کا بنیادی کمٹ منٹ۔ حرف تازہ'' میں یوں لکھتے ہیں:

''ادیب کسی شے سے کمٹ منٹ وقتی طور پر تو کر سکتا ہے لیکن اس کا بنیادی کمٹ منٹ زندگی کی آخری سانس تک بہر صورت ادب کی تخلیق، حسن اور حرفِ تازہ تر سے ہی ہوگا جو پوری زندگی کو حسن کے معیار سے جانچنے اور پرکھنے کے مترادف ہے۔''[۳۰]

احمد ہمدانی کے اداریوں میں شاعری کے نام پر بے ہنگم اور نہ سمجھ میں آنے والی شاعری اور بے مقصد و بے مصرف ادب پر قلم اٹھایا گیا ہے انھوں نے اپنے اداریوں میں صحت مندانہ تخلیقات کے حامل ادب کی سماجی ومعاشرتی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ''کچھ بے رس اور بے مزہ شاعری کے بارے میں'' کے عنوان سے احمد ہمدانی لکھتے ہیں:

''آج کا نسل نو کے نام سے اور جدید طرز اظہار کی چھاپ کے ساتھ جو شاعری ہمارے سامنے آرہی ہے اسکا بیشتر حصہ بے رس اور بے مزہ شاعری پر مشتمل نظر آتا ہے۔''[۳۱]

جدید شاعری کے نام پر ہونے والے تماشے کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''کراچی اور لاہور میں جدیدیت کے بڑے بڑے کارخانے کھلے ہوئے ہیں اور ان کارخانوں میں شاعری کی ٹیکنالوجی مغرب سے درآمد کی جاتی ہے۔''[۳۲]

قیصر تمکین کے اداریے اپنا ایک الگ آہنگ رکھتے ہیں انھوں نے ادب اور سماج میں غیر یقینی صورتحال کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار واشگاف انداز میں کیا ہے وہ ''نئی دنیا کو خدا حافظ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''مارکسی اصولوں یا ان کی مبادیات سے واقف حضرات کو بخوبی علم ہے کہ سماج کی ترقی کی راہ میں کہیں نہ کہیں۔۔ بیشتر اوقات وہ منزل بھی آتی ہے کہ ''اب کیا ہوگا'' کا استفہامیہ دامن کشا ہوتا ہے۔''[۳۳]

قمر عباس ندیم کا شمار بھی افکار کے مہمان مدیروں میں ہوتا ہے، انھوں نے اپنے اداریوں میں ترقی پسند ادیبوں کی حمایت میں قلم اٹھایا ہے ان کے اداریے ترقی پسند رجحانات کی ترجمانی اور حوصلہ افزائی کا جوہر لیے ہوئے ہیں۔ تازہ ہوا اور شجر ممنوعہ کے نام سے ایک اداریے میں لکھتے ہیں:

''غیر ملکی ادبی رجحانات اور تحریکات کی اردو ادب میں کاشت کو ترقی پسندی کے سر منڈھ دینا اور زوال کا سبب گردانا اندھے کی لاٹھی کی طرح ہے کہ بہت دھول اڑتی ہے اور زد میں اپنے پرائے سب آجاتے ہیں۔ خود ترقی پسندی کے ان

مخالفین کے بارے میں کیا خیال ہیجو ایلیٹ، رینے گینو اور فرانسیسی زوال
پسندوں کے اردو ادب میں مجاور بنے بیٹھے ہیں۔'' [۳۴]

افکار کے اشاریوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچنا آسان ہے کہ ان اشاریوں میں مدیروں نے وقت کے تقاضوں اور ادب کے رجحانات پر گہری نظر رکھتے ہوئے ادب کو صحیح سمت میں پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ صہبا لکھنوی کے اشاریوں میں زیادہ تر قومی ترجیحات اور ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہے جبکہ مہمان مدیروں کے اشاریوں میں تنقیدی مضامین کی کمی کو بھی پورا کیا گیا ہے۔ جن کے ذریعے ادب کے تازہ مسائل وتصورات کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے رجحانات کی طرف بھی پیش قدمی کا سراغ ملتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ تمام مہمان مدیر بنیادی طور پر ادب کے ناقدین کی شہرت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ صہبا لکھنوی، آغاز کار بحوالہ افکار جوبلی نمبر ۱۹۷۰ء، ص ۲۲
۲۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی خاص نمبر مئی، جون ۱۹۵۱ء، ص ۳
۳۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، جولائی ۱۹۵۱ء، ص ۲
۴۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، اگست ۱۹۵۱ء، ص ۵
۵۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، نومبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۱
۶۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۱۲
۷۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، مجاز نمبر، جولائی ۱۹۵۶ء، ص ۲۰
۸۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، اکتوبر ۱۹۸۶ء، ص ۱۴
۹۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، جنوری، فروری ۱۹۷۵ء، ص ۱۶
۱۰۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، مارچ ۱۹۷۶ء، ص ۱۳
۱۱۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، انقلاب نمبر، نومبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۶
۱۲۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، اگست ۱۹۶۷ء، ص ۱۵
۱۳۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۱۸
۱۴۔ صہبا لکھنوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، جوبلی نمبر، ۱۹۷۰ء، ص ۲۴
۱۵۔ صہبا لکھنوی، پروفیسر مجتبیٰ حسین چند یادیں چند باتیں مشمولہ افکار کراچی، اگست ۱۹۸۸ء، ص ۳۴۔

۱۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ماہنامہ افکار کا ایک سال مشمولہ افکار کراچی، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۳۰
۱۷۔ محمد علی صدیقی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، نومبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۳
۱۸۔ محمد علی صدیقی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، ستمبر ۱۹۷۸ء، ص ۱۴
۱۹۔ محمد علی صدیقی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، جون ۱۹۷۸ء، ص ۱۲
۲۰۔ محمد علی صدیقی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، جون ۱۹۷۸ء، ص ۱۴
۱۲۔ محمد علی صدیقی، اشاریہ، مکتبہ افکار کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲
۲۲۔ فہیم اعظمی، ڈاکٹر، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، فروری ۱۹۸۹ء، ص ۱۴
۲۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، ماہنامہ افکار کا ایک سال مشمولہ افکار کراچی، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۳۰
۲۴۔ مجتبیٰ حسین، پروفیسر، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۱۲
۲۵۔ صہبا لکھنوی، پروفیسر مجتبیٰ حسین چند یادیں چند باتیں مشمولہ افکار کراچی، اگست ۱۹۸۸ء ص ۳۴
۲۶۔ اکرام بریلوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۱۵
۲۷۔ اکرام بریلوی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، جنوری ۱۹۸۸ء، ص ۱۵
۲۸۔ حنیف فوق، ڈاکٹر، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، ستمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۲
۲۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، ماہنامہ افکار کا ایک سال مشمولہ افکار کراچی، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۳۰
۳۰۔ انجم اعظمی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۱۴
۳۱۔ احمد ہمدانی، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، اکتوبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳
۳۲۔ ایضاً
۳۳۔ قیصر تمکین، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، جون ۱۹۹۲ء، ص ۱۲
۳۴۔ قمر عباس ندیم، اشاریہ مشمولہ افکار کراچی، اگست ۱۹۷۸ء، ص ۱۴

☆☆☆

چارلس ای بڑورتھ/مبشر مہدی

ابونصر الفارابی کے منتخب اقوال

روح اور جسم کی مماثلت اور حساسیت کا تسلسل
انسانی روح اس کی صفات، نیکی اور بدی کے ساتھ

قول نمبر ۱:

کچھ اجسام مصنوعی اور کچھ فطری ہیں۔ مصنوعی اجسام کاؤچ، تلوار اور گلاس کی مانند ہیں جبکہ فطری اجسام انسانوں اور جانوروں کی طرح ہیں۔ ان میں ایک مادہ اور دوسرا ہیئت ہے۔ مصنوعی جسم کاؤچ کی لکڑی کی مانند اور ہیئت کاؤچ کی مانند ہے۔ جسے مربع، دائرہ یا کچھ اور کہا جاسکتا ہے۔ مادہ اصل می کاؤچ ہے اور ہیئت کے ملاپ سے حقیقاً کاؤچ بنتا ہے۔ فطری جسم کا مادہ اس کے عناصر ہیں اور ہیئت وہ جسے وہ اختیار کرتا ہے۔ اقسام مادوں سے مماثلت رکھتی ہیں اور متفرقات ہیئت سے۔

قول نمبر ۲:

روح کے پانچ اہم حصے اور مختلف جہتیں ہیں۔ غذائی، حیاتی، تخیلاتی، نفسانی اور فکری۔

(ا) غذائی عرصہ وہ کہ جب غذا خاص عمل کے ذریعے تشکیل پاتی ہے، اسی کے تین حصے ہیں، اول، درمیانی اور آخری۔ اول وہ کہ جب غذا ابھی مکمل ہضم نہیں ہوتی اور آخری وہ جب غذا مکمل طور پر ہضم ہو جاتی ہے اور رکن اس سے لذت اٹھا سکتا ہے۔ درمیانی صورت دو اقسام پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک وہ جو انتڑیوں اور معدے میں معلق رہ کر خون مہیا کرنے کا باعث بنتی اور پھر یہ حصہ ہضم ہو کر مکمل طور پر خون بن جاتا ہے۔

غذائی حصے کے مزید حصے ہیں، ان میں ہاضمہ، بڑھوال، افزائش نسل، چاہت، حافظہ، تخصیص اور اخراج کی صلاحیتیں ہیں۔ غذائی حصے کی یہ خوبی ہے کہ وہ خون کو متحرک رکھتا ہے اور ہر رکن تک سرعت کے ساتھ پہنچ کر اس کا حصہ بن جاتا ہے۔ ہاضمہ غذائی حصے سے منسلک ہے، اس شکل میں کہ معدے اور انتڑیوں میں، کہ یہ خون میں اس طرح رس بس جاتا ہے کہ جگر میں خون روانی سے حرکت کر سکے۔

بڑھوال اس تناظر میں اثر انداز ہوتی ہے کہ ہر عضو اپنی مقدار کے مطابق اپنے ممکنہ حجم تک پہنچ جاتا ہے۔

افزائش نسل کا مرحلہ تب مکمل ہوتا ہے جب غذائی اجزا کیمیائی عمل سے خون میں تبدیل ہو جائیں اور اس کی دو اقسام ہیں: ایک مادہ، جو کہ عورت کے روپ میں ہے اور دوسرا ہیئت جو مرد کی شکل میں ہوتی ہے اور وہ جوان سے تخلیق پاتا ہے وہ ان سے قسمی اعتبار سے مماثلت رکھتا ہے۔

چاہت کا مرحلہ اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے جب وہ جسم کے ساتھ باہمی طور پر پیوستہ ہو جائے۔

حافظے کی صلاحیت غذائیت کو جسم میں محفوظ کرنے کے بعد مکمل ہوتی ہے۔

تخصیصی عنصر اس وقت ظہور پذیر ہوتا ہے جب وہ زائد مقدارِ غذائی اور دوسرے غذائی اجزا میں امتیاز پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے سے مشابہہ کر دیتا ہے۔

اخراجی جزو، جب زائد غذائی مقدار خارج ہو جائے تو ترتیب پاتا ہے۔

(ب) حواسی تعقل وہ وقت ہے جو پانچ حسوں کے ذریعے ادراک کرتی ہے۔

(ج) قوتِ متخیلہ حواسی تعقل کو محفوظ کرتی ہے، مختلف صورتوں میں، مختلف طریقوں سے، جن میں سے کچھ صحیح اور کچھ غلط ہیں اور یہ عمل سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی جاری رہتا ہے اور غذائی جزو اور متخیلہ دوسرے قوی سے ہٹ کر سونے میں بھی متحرک رہتے ہیں۔

(د) نفسانی وقت کسی خواہش کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے مثلاً بھوک، اور اسی قوت کے زیرِ اثر نفرت، چاہت، فراریت، ترجیح، غصہ، قناعت، خوف یا جرات، قہر یا رحم، محبت یا نفرت، جذبہ، خواہش اور دوسرے حادثاتِ روح، اس طرح کی متحرک قوتیں ہیں جو جسم میں اپنی کاملیت کے ساتھ متحرک رہتی ہیں جس طرح سے انسانی جسم میں دفاع کے لئے بازو، ٹانگیں اور دوسرے عضو۔

(ر) عقل کے ذریعہ سے انسان دانش حاصل کرتا ہے اور ادراک کر سکتا ہے اچھے اور برے اعمال میں جس کے دو حصے ہیں۔ عملی اور نظری۔ عملی مہارت اور حسابی قوت پر انحصار کرتا ہے۔

نظری میں ان اشیا کا ادراک کیا جاتا ہے جو شئے یا لاشئے کی حالت میں ہوں۔ اس کی مثال جفت اور طاق کی طرح سے ہے، یعنی جفت عدد طاق میں تبدیل نہیں ہو سکتا اور طاق کو جفت عدد میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح لکڑی کو گول اور چوکور شکل میں تو تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن لکڑی کی حالت بعینہ تبدیل نہیں کی جاسکتی۔

عملی حالت میں اشیا کو مہارت کے ذریعے ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مثلاً بڑھائی کی مہارت، کھیتی باڑی، طب اور جہاز رانی وغیرہ جن میں فکر درکار ہوتی ہے اور ہم اپنی مرضی سے اس کو بھی، خواہ ممکن ہو یا ناممکن۔ اور اگر ممکن ہو تو کیسے۔

قول نمبر ۳:

نیکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں اخلاقی اور فکری۔ فکری وہ نیکیاں ہیں جیسے دانش، تعقل، ہوشیاری، مستعدی، ذہنی چابک دستی اور بہترین سمجھنے کی صلاحیت۔ اخلاقی نیکیوں میں اعتدال، ہمت، آزاد خیالی اور انصاف نمایاں ہیں جبکہ اس کے برعکس بدی کی قوتیں اپنے مقاصد میں نیکی کی طرح سرگرمِ عمل نظر آتی ہیں۔

قول نمبر۴:

اخلاقی نیکیاں اور بدی عادت پختہ ہونے کے ساتھ روح میں جڑ پکڑتی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہو جاتی ہیں بالکل اسی طرح سے جس طرح سے لکھنے کا فن ہماری طبیعت میں راسخ ہو جاتا ہے اور اسی طرح سے یہ اخلاقی نیکی اور بدی عادت کا حصہ بن جاتی ہے۔

قول نمبر۵:

فطرت انسان میں شروع سے ہی صلاحیت پیدا نہیں کرتی کہ اس کا رجحان اچھائی یا برائی کی طرف ہو۔ بعینہ جیسے فطرت کسی کو جولاہا یا مذہبی لکھاری نہیں بنا سکتی۔ فطری رجحان ایک خصوصیت کے ساتھ روح میں، اس وقت قائم ہوتا ہے جب اچھائی کی سمت میں ہو اور اسے نہ خوبی کہا جا سکتا ہے نہ خامی جب تک ایک طرح کا عمل جاری و ساری نہ ہو۔ اس کی مثال دو لفظوں جیسی ہے کو ایک ہی معنی رکھتے ہوں اور ان میں پہلے آنے والا لفظ بھی وہی مفہوم ادا کرے جو بعد میں آنے والا لفظ۔ کسی شخص کی عادت میں جو اعمال راسخ ہو جاتے ہیں وہی باعثِ تعریف یا باعثِ تنقیص بنتے ہیں۔

قول نمبر۶:

ایسے شخص کا وجود نہیں جو مکمل طور پر تمام نیکیوں کا مالک ہو اور اسی طرح سے کوئی ایسا بھی نہیں جو مکمل طور پر بدی کی طرف مائل ہو۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ ہر کوئی ایک خاص نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے، نیکی کے مخصوص مجموعہ کی طرف، مخصوص مجموعۂ فن کے لئے۔ لہٰذا ایک فرد ایک خاص چیز کے لئے، دوسرا دوسری کے لئے اور ایک تیسرا کسی تیسری نیکی یا فن کے لئے۔

قول نمبر۷:

جب فطری رجحانات یا خصوصیات اچھائی یا برائی کے لئے اخلاقی عادات سے مشابہت رکھتی ہوں تو انسان مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ مشکل امر ہوتا ہے جب اچھائی یا برائی انسان میں پختہ ہو جائے تو اسے ختم کرنا۔ تو جب ایسا انسان وجود رکھتا ہو جس کے اندر اچھائی بدرجہ اتم پائی جائے تو وہ ان اوصاف کے یک جا ہونے کے بعد انسانیت کے مرتبے کو چھو لیتا ہے۔ قدماء اسے الوہی شخصیت کہتے تھے۔ اس کے بر عکس ایسا شخص جس میں تمام برائیاں بام عروج پر نظر آتی ہیں اور وہ پختہ بھی ہوتی ہیں تو اسے قدماء وحشی جانور کے نام سے پکارتے تھے۔ ایسا شخص جو اچھائیوں کے ساتھ بلند درجے پر فائز ہو کر لوگوں کی خدمت کرتا ہے وہی بادشاہ کہلانے کا حق دار ہوتا ہے اور جو اس کے برعکس ہوتا ہے وہ شہروں سے چلا جاتا ہے۔

قول نمبر۸:

کچھ فطری خصوصیات اور رجحانات ختم کیے جا سکتے ہیں اور تبدیل بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جو خصوصیات پختہ ہو جائیں روح میں انہیں کی جگہ۔ دوسری عادات ایسی ہیں کہ جن کی طاقت ٹوٹ سکتی ہے مگر ختم نہیں ہو سکتیں اور دوسری ایسی ہیں جنہیں نہ ختم کیا جا سکتا ہے نہ تبدیل بلکہ مزاحمت کے ذریعے برداشت کرنا پڑتا ہے اس طرح کہ اپنی روح کو پابند کیا جائے انہی اعمال سے جھگڑنے کے ذریعے اور بالآخر اس کے برعکس عمل کرنے میں ایک انسان کامیاب ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح بری عادات بھی پختہ ہو جاتی ہیں اور انہیں درج بالا صورتوں میں منقسم ہیں۔

قول نمبر۹:

اسی طرح فرق ہے ایسے آدمیوں میں جو خود احتسابی کرتا ہے اور وہ جو اچھا ہے اور اس جذبے اور خواہش کے ساتھ برائی کو روکتا ہے جو اس کی خصوصیات اور متاثر ہونے کی صلاحیت سے وابستہ ہے۔ پہلا تنگ آ جاتا ہے اچھے اعمال کرنے پر جبکہ بہتر وہ ہے جو اس راستے پر چلتا ہے جس پر اسے اس کی خصوصیات اور خواہشات لے جاتی ہیں۔ اچھے اعمال کرنے والا (جذبے اور خواہش کے ساتھ) اکتانا نہیں بلکہ ان سے لطف حاصل کرتا ہے۔

یہ ایسا ہے جیسے ایک شخص تکلیف برداشت کرتا ہے، اس کے برعکس ایسا شخص جو بغیر تکلیف کے معتدل رہتا ہے۔ جو معتدل ہے وہ روایتی قانون کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہر معاملے میں اعتدال پر رکھتا ہے۔ اور ایک وہ جو روایتی قانون کا پابند ہے وہ اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ وہ روایتی قوانین کو اپنے اعمال میں پابند بنائے۔ جو شخص اپنے آپ کو روایتی قوانین کا پابند کر سکے وہ بہت سے معاملات میں اس شخص کی شاید جگہ لے سکے جو اچھا ہے۔

قول نمبر۱۰:

وہ شخص جس کے اخلاق قابل تعریف ہوں اور جس کی روح اچھائی اور برائی میں تمیز رکھتی ہو اس شخص سے بدرجہا بہت ہے جو اپنی خود احتسابی کرتا ہے۔ اگر شہر کا حاکم اپنے قول و فعل اور کردار میں یکساں ہو تا وہ اس خود احتسابی کرنے والے شخص سے نمایاں ہے۔ اس کے برعکس ایک خود احتسابی کرنے والا شخص اس شہری سے بہتر ہے کو اچھا ہے اگر اس کی خصوصیات فطری ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ روایتی قانون کا پابند ہے اور جو اچھا ہے، دونوں کی کوشش ایک ہے اور اگر کسی شہری میں خامی ہے تو اس کی خامی کی درستگی حکمران کی پہنچ میں ہے مگر اگر حکمران بدعنوانی کا شکار ہے تو اس کی رعایا اس میں شریک ہو جاتی ہے اور اس کی ضرر رسانی کی حد لامحدود ہے۔ لہٰذا حکمران کا کردار اور فطری سطح پر اچھا ہونا ضروری ہے اور اس کا صلہ یہ ہے کہ اس کی عوام درست اخلاق ہیں۔

صابر ظفر

اُجالا چھلنی سے نکلا تھا منظرِ شب میں
کہ جگنوؤں نے کیے چھید، چادرِ شب میں

ستارے دیکھتے رہتے ہیں رشک سے مجھ کو
اُڑان بھرتا ہوں، گم ہو کے شہپرِ شب میں

خرابہ کون سا ہوتا نجانے اپنا نصیب
اُتر نہ جاتے جو ہم دونوں ساغرِ شب میں

جو کارِ منصفی آئے تو دن نکل آئے
ہمیشہ اونگھتا رہتا ہوں دفترِ شب میں

جو میرے ساتھ تھے، چپ ہو گئے وہ اہلِ قفس
کراہتا ہوں میں زندانِ محشرِ شب میں

وہ سارے بجھ بھی چکے، آس پاس تھے جو چراغ
مرا وجود منور ہے پیکرِ شب میں

ہمیشہ کے لیے وہ خواب ساتھ دے تو ظفر
ہمیشہ ہی رہوں آغوشِ بسترِ شب میں

☆☆☆

صابر ظفر

اُسے گزار چکے ہوتے جانے کب کے ہم
مگر ہے دُکھ کہ نہ تھے آدمی طرب کے ہم

ہم ایک شہر میں تھے ایک لہر میں، لیکن
کچھ اور اُس کا چلن تھا، تھے اور ڈھب کے ہم

غبار اپنا بھی دُور اُس سے بیٹھے، مثلِ میرؔ
زمانہ جانتا ہے، لوگ ہیں ادب کے ہم

ہدف نہیں تھے ترا، تیری زد میں آ گئے ہیں
نشانہ بن گئے، ظالم! ترے غضب کے ہم

اگرچہ وقت کی حد سے نکلنا چاہتے ہیں
مگر اسیر ہیں زندانِ روز و شب کے ہم

قفس میں اہلِ قفس بھی ہمیں نہ پہچانیں
ہمارا کوئی نہیں، ہیں اگرچہ سب کے ہم

ہم اہلِ دل تھے ہمیں خود پہ ناز بے حد تھا
ظفر گزارتے کیوں زندگانی دب کے ہم

☆☆☆

صابر ظفر

شبِ گریہ آن پہنچی کہ ہوا وداعِ یاراں
سرِ دشتِ کربلا ہے، یہ ہجومِ غم گساراں

مرا پیرہن تو دیکھو، یہ سیہ کفن تو دیکھو
ہے امانتِ شہیداں، یہ لباسِ سوگواراں

نہ کسی سے کچھ تکلّم، سبھی اپنے آپ میں گم
کوئی چشم ہو تو دیکھے، یہ نصیبِ بے قراراں

نہ ہی نام اُس کا باقی، نہ کلام اُس کا باقی
کہ بنا نشانِ عبرت، وہ رُخِ جفا شعاراں

کوئی آ گئی قیامت، رہیں تشنگاں سلامت
نہ فرات مہرباں ہے، نہ تپاکِ بادوباراں

یہ ستم قفس تلک ہے، یہ خزاں تو آج تک ہے
سرِ حشر دیکھتا ہوں، کوئی موسمِ بہاراں

مرا غم عیاں ظفرؔ ہے، یہ مگر مجھے خبر ہے
یہاں شامِ شورِ زنداں، وہاں شام شہرِ یاراں

صابر ظفر

مری اور ہی لگن ہے، مرا اور ہی جنوں ہے
قد و قامت رقیباں، مرے آگے سرنگُوں ہے

کوئی خواب دیکھتا ہوں تو سراب دیکھتا ہوں
وہ نظر کوئی ہے جادُو، وہ بدن کوئی فُسوں ہے

یہ ستم کا دَور دیکھو، اِسے تُم بغور دیکھو
یہ مزارِ عاشقاں ہے، مری خواہشوں کا خُوں ہے

نئے غم کی ضَو ملے گی تو حیاتِ نَو ملے گی
سرِ دار اُداس کیوں ہے، مرے یار اُداس کیوں ہے

کوئی زخم تو نیا ہو، کوئی دَرد تو سوا ہو
ہے وہی دل شکستہ، وہی حالتِ زبُوں ہے

میں خموش دیکھتا ہوں کہ بنا ہے شہر، زنداں
کوئی کہہ رہا ہے یوں ہے، کوئی کہہ رہا ہے یوں ہے

یہ عجیب وحشتیں ہیں، یہ عجیب دہشتیں ہیں
نہیں شہر میں ظفرؔ وہ، جو قفس میں اب سکُوں ہے

☆☆☆

صابر ظفرؔ

تنہائی کی طاقت سے
گزرا میں اُس جلوت سے

ٹوٹ چکا تھا ایک بدن
جوڑا اُس کو چاہت سے

ٹھٹھر چکا تھا ایک بدن
لپٹا میری حدت سے

بکھر چکا تھا ایک بدن
سمٹا میری قربت سے

چمک رہا تھا ایک بدن
چاہا اُس کو شدت سے

صابر ظفرؔ

یہ جو اجل نصیب ہے ، آرام ہی تو ہے
گویا لحد کی تیرگی اِک شام ہی تو ہے

قاتل تجھے تو لے گئے ہم سے بہت ہی دُور
اب زندگی ہماری ، ترا نام ہی تو ہے

ہر آن مرنا چاہتے ہیں رفتگاں کے ساتھ
تنہا نہ جینا چاہیں ، یہ الزام ہی تو ہے

آزاد روز و شب تو تجھے دے چکے ہیں ہم
زنداں میں کیا ہے، موت کا ہنگام ہی تو ہے

کی منتخب جو ہم نے ظفرؔ ، فیضؔ کی زمیں
یہ اپنے واسطے کوئی انعام ہی تو ہے

☆☆☆

صابر ظفرؔ

ممکن ہے جتنا ، اُس سے زیادہ بکھیر دے
میں خود یہ چاہوں ، میرا برادہ بکھیر دے

یہ شام ماتمی ہے تو ممکن نہیں نشہ
یعنی سبو بکھیر دے ، بادہ بکھیر دے

ایسا نہ ہو کہ نیّتِ شب ہی حرام ہو
کنگن کو توڑ دے ، شبِ وعدہ بکھیر دے

منزل نہیں کوئی تو ضروری نہیں سفر
اسبابِ ہم سفر ، سرِ جادہ بکھیر دے

مقتل میں زندگی ہو تو کیا زیب دے تجھے
اِک آن میں مرا دلِ سادہ بکھیر دے

زندانِ آرزو میں پڑا ہے مرا وجود
سارا بکھیر دے کہ وہ آدھا بکھیر دے

کیوں دیر ہو بساط اُلٹنے میں پھر ظفرؔ
جب خاکِ بادشاہ ، پیادہ بکھیر دے

صابر ظفرؔ

میں تری موت کا اظہار کروں یا نہ کروں
یعنی کچھ تذکرۂ دار کروں یا نہ کروں

تُو جہاں ڈوبا، وہاں زیست کی صورت کیا ہے
میں یہ دریائے اجل ، پار کروں یا نہ کروں

مسئلہ یہ ہے کروں یا نہ کروں اُس کو معاف
دشمنِ جاں پہ کوئی وار کروں یا نہ کروں

جس کی نخوت نے کیا خُون مری عاجزی کا
تار تار آج وہ دستار کروں یا نہ کروں

تُو مری جان تھا ، تُو نے بھی وفا کی نہ ظفرؔ
میں ترا آخری دیدار کروں یا نہ کروں

☆☆☆

صابر ظفر

غم اِس لیے بھی غم نہیں
تیری محبت کم نہیں

دیکھیں جمالِ خوش بدن
آنکھوں میں اِتنا دم نہیں

پلکوں کا ہے یہ سائباں
یہ دھوپ کا پرچم نہیں

بس ایک یادِ یار ہے
یاں دوسرا عالم نہیں

ہر سُو شعاعِ مہر ہے
آ بیٹھ یاں شبنم نہیں

واقف ہے میری آگ سے
شعلہ بدن برہم نہیں

چہرہ ابھی گُلنار ہے
آنکھیں ابھی پُر نم نہیں

چھُو ہی نہ پائیں جو تمہیں
نازک بدن وہ ہم نہیں

ہم تیرے در کے وہ غزال
جو آشنائے رَم نہیں

☆☆☆

صابر ظفر

کیا اِن دنوں ہے حالِ دلِ زار ، کچھ کہو
یہ بھی کہا نہ جائے گا پھر ، یار کچھ کہو

کیا دھوپ ہی رہے گی ہمیشہ نصیب میں
کیا چھاؤں لُٹ چکی پسِ دیوار ، کچھ کہو

کیا داستانِ ہجر سنانا محال ہے
کیا مر چکے ہیں طالبِ دیدار ، کچھ کہو

یوسف نہیں رہا کہ زلیخا نہیں رہی
کیا قحط پڑ گیا سرِ بازار ، کچھ کہو

پیغامِ وصل بھیجنا ممکن نہیں ہے کیا
جائے نہ کیا صبا ، سوئے گلزار ، کچھ کہو

محرومیوں سے ہو گئے مشکل پسند ہم
آسان کچھ نہیں ہے تو دشوار کچھ کہو

زنداں میں کیا کِھلا نہیں گُل کوئی بھی ظفر
کیا ہر طرف خزاں کے ہیں آثار ، کچھ کہو

سید تحسین گیلانی

جھڑکیاں

تاریخِ انسانی میں جھڑکیوں کا آغاز یقیناً انسان کی ابتداء سے ہی ہو گیا۔ مگر میں اِن کی ترقی کے ضمن میں اتنا ہی کہوں گا کہ ایک یہی کام ہے جو تمام عمر انہوں نے کیا یعنی اِن میں ترقی کرنے کا بے حد جنون رہا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اِن کی ترقی نے انسانی زندگی پہ ہمیشہ دو طرح کے اثرات مرتب کیے! یعنی دو واضح تبدیلیاں ہمیشہ ''جھڑکیوں'' کی بدولت انسان کے اندر رونما ہوئیں اور اُن تبدیلیوں کی وجہ سے انسان نے خود کو مٹایا بھی ___ اور ___ بنایا بھی ___ مٹا لینے کی بھی دو معنوی حیثیتیں ہیں اور وہ دونوں حیثیتیں خود ایک دوسرے کی مخالف ہیں یعنی ''جذب'' کر لینا اور جذب نہ کر پانا'' ___ جی ہاں یہ دو حالتیں ہی اہم ہیں ___ یعنی جذب کر لینے والا بھی خود کو ''مٹا'' لیتا ہے اور جو جذب نہ کر پائے وہ بھی خود کو مٹا ہی لیتا ہے۔

جھڑکیاں ذاتی طور پر بُری نہیں ہیں ہاں اِن کی وجہ سے دو شخصیتوں کی پہچان میں کافی حد تک مدد ملتی ہے۔ دیکھئے جھڑکیاں ہمیشہ طرفین اور جانبین کے درمیان کسی فعل کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ جی ہاں اگر کوئی تیسرا ذی شعور وہاں موجود ہو تو وہ تمام حالات و واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دونوں میں سے اصل قصور وار کا اندازہ اپنے تائیں لگا سکتا ہے ___ ! اب بات ہو ہی رہی ہے تو میں بھی کچھ فلسفہ جھاڑتا ہوں۔ اِس بارے تو یہی کہوں گا کہ جھڑکیاں دینے والا چاہے جس قدر بھی معزز، معتبر اور وضع دار شہری ہو جب وہ اِس نازیبا فعل کا مرتکب ہوتا ہے تو اُس کی شخصیت کے بہت سے خفیہ پرت اپنے آپ کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ مثلاً ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص جو ڈانٹ پلا رہا ہے اِس میں برداشت کا مادہ نہ ہونے کے برابر ہے یا یہ کہیں کہ اُس فرد کی اِس خامی کو کل لوگ بطور ہتھیار بھی استعمال کر سکتے ہیں مثلاً جان بوجھ کر اُس کا نقصان کرنا اور اُس کی جھڑکیوں کی طویل فہرست سننا اور پھر اچھا خاصہ تماشا لگا کر معذرت خواہانہ روّیہ اختیار کر لینا ___ اور پھر بار بار اُس کی زندگی میں اِس ہتھیار کو استعمال کر کے اُس کی اِس کمزوری سے فائدہ اُٹھانا۔ ہاں کچھ جھڑکیاں برمحل اور برموقع بھی ہوتی ہیں مثلاً ___ والدین کی اولاد کے لیے جھڑکیاں ___ اساتذہ کی طلباء کے لیے جھڑکیاں ___ لیکن بات پھر وہی کہ دو قسم کی صورتیں ہمیشہ جھڑکیوں کی وجہ سے سامنے آئی ہیں۔

مثلاً میرا دوست ''الف'' بہت فطین ہے۔ میں اُس کی قابلیت کا قائل ہوں اور میں نے اُس کی لائقی اور تیزی کو بارہا پرکھا اور وہ ہر امتحان میں کامیاب رہا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ

کیوں BSC نہ کر سکا بلکہ اُس میں کوئی کمی بھی نہ تھی ___ اُس نے بتایا کہ جھڑکیوں نے کس طرح اُس کی زندگی کو ایک بہترین رستے سے ہٹا دیا جبکہ اب بھی وہ دو ماسٹر ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد بطور ٹیچر اپنے فرائض نبھا رہا تھا ___ مگر ان جھڑکیوں نے اُسے بہت آگے جانے والے راستے سے ہٹا کر رکھ دیا ___ اُس نے بتایا ہمارے ایک ٹیچر تھے وہ مجھے کلاس میں کھڑا کر لیتے اور میری جسمانی ساخت میری کم گوئی اور میری شرافت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے تقریباً ڈانٹنے کے انداز میں کہتے (اوے توں کدی وی .B.Sc نہیں کرسکدا اے بڑا اوکھا کم آ، اے تیرے وس وچ نئیں) ''بھئی تم کبھی بھی .B.Sc نہیں کر سکتے یہ بڑا مشکل کام ہے اور یہ تمہارے بس کا نہیں'' کیونکہ وہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ کوئی سوچ بھی اپنی نہیں ہوتی اور نہ ہی اندر پختگی ہوتی ہے ہر چیز حالات کے مطابق اثر کرتی ہے کیونکہ میں اپنی محنت سے اور اپنے خرچے پر ہی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا اس لیے میں ڈر گیا اور ڈپریشن کا شکار ہو کر گھر بیٹھ گیا ___ اور اِن جھڑکیوں نے میری زندگی میں طوفان برپا کر دیا یہ میرے ارادوں کو اُکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گئیں لہٰذا میں .B.Sc نہ کر سکا ___ یہ تو ایک واقع ہے۔۔۔ مگر نہ جانے کتنے واقعات روزانہ ہمارے اِردگرد رونما ہوتے ہیں جو شاید اِس سے بھی بڑھ کر ہوں ___ لیکن نہیں ___ اصل یہ نہیں ہے اِس کے آگے بھی کچھ ہے ___ اب آپ کہیں گے وہ کیا؟ ___ تو وہ یہ کہ گذشتہ روز مجھے ایک ایسے نوجوان سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کا مدّعا تقریباً میرے دوست ''الف'' سے ملتا جلتا تھا مگر اِس کے نتائج حیران کُن طور پر اُلٹ تھے۔ میرے اُس دوست نے اپنی زندگی کا سفر بڑی کامیابی سے طے کیا اور طے کرتا جا رہا ہے ___ بس حیران کن بات یہ تھی کہ جب میں نے اُس سے پوچھا کہ تمہاری زندگی میں اِس قدر کامیابیاں کیسے آئیں اور اس سب کی بڑی وجہ کیا ہے تو وہ پہلے تو ہنسا پھر کہنے لگا ___ جھڑکیاں ___ میں بہت حیران ہوا اور میں نے ایک ہی سانس میں اُس سے کئی سوال کر ڈالے ___ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ___ جھڑکیاں کسی کو کیسے کامیابی دلا سکتی ہیں اور یہ ممکن بھی ہے ___ تو سنو! وہ ایسے کہ جب بھی مجھے کوئی جھڑکیاں دیتا یا ڈانٹتا تو میرے اندر بیٹھی ہوئی کوئی طاقت مجھے پہلے سے بھی زیادہ کام کرنے اور دوبارہ ایسی صورتِ حال سے بچنے کی ترغیب دیتی۔ یعنی میرے اندر ایک مادہ چھلاوہ بن جاتا اور میں انسان سے مشین بن جاتا میرے اندر ماورائی طاقتیں جنم لیتیں اور مجھے کام کام اور زیادہ کام پر مجبور کرتیں اور میں اُڑتا چلا جاتا۔ آگے ہی آگے ___ آج اِن جھڑکیوں کا ہی ثمر ہے کہ میں آج ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کامیاب زندگی گزار رہا ہوں چونکہ میں خاندانی طور پر آسودہ حال تھا اس لیے میری زندگی پہلے سے بھی زیادہ کامیاب ہوگئی ___ لیکن میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ''جھڑکیاں'' زیادہ تر سننے والے کے لیے بمباری ثابت ہوتی ہیں اور دوسرا یعنی سننے والا خود کو کمتر سمجھتے ہوئے خود میں سمٹنا شروع ہو جاتا ہے اور آخر کار وہ اپنے ہی اندر ایک دن دَب کر مر جاتا ہے ___ چونکہ مشرق میں یہ روایت عام ہے ___ اس لیے میں جھڑکیوں کو کسی بھی پھلتی پھولتی قوم کی راہ کا سب سے بڑا پتھر تصور کرتا

ہوں ___ کیونکہ آپ مشاہدہ کریں تو آپ کو پتہ چلے کہ کتنے لوگ آسودہ حال ہیں۔

لیکن بہت سوچنے اور مشاہدہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ یہ دوسری قسم کی صورتِ حاصل بہت کم کم وقوع پذیر ہوتی ہے چونکہ پہلی قسم کے لوگ زیادہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جھڑکیوں کی وجہ سے کئی افراد اندرونی طور پر تہس نہس ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری طور پر بھی عدم تحفظ کا شکار ہو گئے، مگر یہ سوال اپنی جگہ پہ قائم ہے کہ اِن سب حالات کا سبب بنیادی طور پر ''جھڑکیاں'' خالصتاً صرف ''جھڑکیاں'' ہی ہیں یا اصل اِس کے پیچھے خود انسان کھڑا ہے اور یہ رویہ برے رویوں میں سب سے اُونچے درجے پر فائز ہو گیا ہے۔ رویے کسی بھی تہذیب کا بنیادی حصہ ہوتے ہیں اِن کا ہونا افراد کے لیے اُن کی پہچان کا باعث ہوتا ہے مگر اِن کا اچھا برا ہونا اُن افراد کے لیے باعثِ عزت اور باعثِ ذلت دونوں کا موجب بھی ہو سکتا ہے ہم سب چونکہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں اور سب اپنی ہی کھودی ہوئی قبروں کے دہانے پر کھڑے ہیں اس لیے ہمارے رویے بھی بدتہذیبی کا شکار ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مرچ کے پودے سے انگور کی توقع کی جائے۔

جھڑکیاں اصل میں تشدد کی پہلی سیڑھی ہے، لیکن اصلاً یہ تشدد سے بھی کچھ بڑھ کر ہیں کیونکہ ظلم کی انتہا تشدد ہے اُس سے آگے تو کچھ نہیں لیکن ''جھڑکیاں'' عملاً دوسرے آدمی کے لیے ذہنی انتشار کا باعث ہوتی ہیں جب سکون ہی برباد ہو گیا تو کیا بچا یقیناً سکون دنیا کی سب سے بہترین شے جس کے پاس یہ دولت ہے وہ دنیا کا سکھی ترین انسان ہے اور جھڑکیاں کسی بھی انسان کو اِس فہرست سے خارج کرنے کا آسان ترین ذریعہ ہیں۔

جو قومیں اس طرح کی انتشاری ذہنی کیفیت میں تادیر مبتلا رہیں اور جن کے لیے یہ معمول کی بات ہو وہ پہلے تو کسی کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور اگر وہ سامنے آ بھی جائیں تو اُن میں اعتماد کی اتنی کمی ہوتی ہے کہ وہ خود کو گرتا گرتا محسوس کرتے ہیں اور اُن کے اندر کی فضا میں خوف کا عنصر اِس قدر نمایاں اور اِس قدر تیزی کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے کہ وہ شخصیت اُدھوری اور اکہری رہ جاتی ہے ___ ہمارے ہاں عموماً بچوں کو بچپن سے ہی ''جھڑکیوں'' کا سامنا کرنا پڑتا ہے ___ یہ کرو ___ یہ نہ کرو ___ ادھر مت جاؤ ___ یہ مت کھاؤ ___ یہ کیوں توڑا ___ ایسا کیوں ہوا ___ وغیرہ جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں ایسا نہیں ہے۔ وہ بچے کو مکمل تحفظ اور اعتماد سے بھرپور زندگی گزارنے کا موقع دیتے ہیں جس کی بدولت وہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جا رہے ہیں۔ مگر ہم میں ایسے کتنے ہیں جو جھڑکیوں کے مقابل خود کو کھڑا کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو میرا اور آپ کا مشترکہ ہے؟

میں نے کیا کہا یہ اپنی جگہ! اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کیا کہتے ہیں؟

☆☆☆

عبید راشدی، سندھی سے ترجمہ: ننگر چنا

اُٹھے ہوئے قدموں کی اُڑتی ہوئی دھول

''کون؟ اچھا تم!!''

''ہاں، میں۔ بہشت ہانکا ہوا۔''

''کیسے ہو؟''

''بدحال۔''

''امتحان کا سناؤ؟''

''کسی ایک امتحان کا پوچھو تو بتاؤں۔''

''کب لوٹو گے؟''

''جب تیرا دل کہے بلوا لینا۔ کہو تو اسی وقت بادبان چڑھا لوں۔''

''پاگل! ایسا مت کرنا۔ پہلے بھی کئی امتحان مِس کر چکے ہو۔''

''پھر بھی تیرے امتحانوں اور آزمائشوں میں سرخرو رہا ہوں گا۔''

''----------''

''پھر کب آؤں؟''

''آرام سے ٹریننگ پوری کرو، امتحان دو، پاگل پن نہ دکھاؤ۔''

''بس اب تو سرمد کی طرح الف ہونے کی ضرورت ہے۔''

''موسم کا سناؤ؟''

''باہر کے موسم کی کوئی سُدھ بُدھ نہیں۔ البتہ مَن کے بَن میں تیری جدائی کی تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔''

''تبھی بتائے بغیر چلے گئے تھے!؟''

''تم سے دُور کب ہوا ہوں جو اجازت لیتا۔''

''----------''

''آواز نہیں آ رہی؟''

''تم ریسیور پر ہونٹ رکھ دو۔ تیرے خاموش ہونٹوں پر نظم لکھ دوں گا۔''

''ہاں۔ امتحان کا پوچھ رہی تھی۔''

''کون سے امتحانوں کا پوچھتی ہو۔ میں نے تو زندگی کے اس صحرا میں قدم قدم پر تمہارے انتظار اور چاہتوں کے مشکل ترین امتحان دیے ہیں، پھر بھی پوچھتی ہو کہ امتحان! لیکن کبھی کبھی یہ چاہتوں کے امتحان بھی آؤٹ آف کورس لگتے ہیں۔''

''----------''

''----------''

''سنو۔ اتنے دنوں میں ہم صرف کل ہی شہر سے باہر اوڑک اور سیدو شریف جا سکے تھے، جہاں آزاد فضا میں کئی جوڑے کسی روک ٹوک کے بغیر گھوم پھر رہے تھے۔ بس ایک میں ہی تنہائی کے جہنم میں جل رہا تھا۔ پھر ہماری لیڈی انسٹرکٹر جو کرسچین ہے نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ شاید میری اُداسی اور بے چینی کو جان گئی تھی۔ لیکن کون کسی کے مَن پر بچھے ہوئے اُداسی کے زرد پتے ہٹا سکا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک اچھی پامسٹ بھی ہے لیکن میں اسے یہ بتاتے بتاتے چپ ہو گیا کہ تم نے ایک برس پہلے کسی اور کے نام کی چنری اوڑھ لی تھی۔۔۔۔''

''ہمارے دیس کی بیٹیوں کی چنریوں میں جتنے موتی ہوتے ہیں اتنی ہی الجھنیں اور حسرتیں بھی''۔

''اور کوئی خبر؟''

''اکیلے پن نے مار ڈالا ہے۔''

''اکیلے اور تم!؟''''تم تو لیڈی انسٹرکٹر کے ساتھ شامیں گزار رہے ہو۔ پھر بھی اکیلے ہو؟''

''اری پگلی! وہ تو مجھ سے عمر میں دس برس بڑی ہے اور پھر اس کے ساتھ رشتہ بھی استاد شاگرد والا ہے۔''

''تم ہمیشہ پرانے داغ پینٹ کرتے ہو۔''

''ناراض مت ہو۔''''کوئی گڑبڑ ہوتی تمہیں کیوں بتاتا۔''

''دن کیسے گزرتے ہیں؟''

''پو پھٹے ٹریننگ پہ چلے جاتے ہیں اور شام کو تھکے ہارے کچھ دوست شہر کو نکل جاتے ہیں، لیکن میں اکیلا اجنبی ہوسٹل کے اجنبی کمرے میں جاتا ہوں اور رات کو ٹیبل لیمپ کی دھندلی دھندلی روشنی میں اپنے آپ کو تلاش کرتا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں دھند میں لپٹے ہوئے انسانی رشتوں کے بارے میں۔ سنو! مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے دل بھی ہوسٹل کے کمروں کی طرح ہوتے ہیں، جن میں ہر شخص اپنا ٹینیور مکمل کر کے آگے نکل جاتا ہے۔''

''اور کیا محسوس کرتے ہو؟''

''----------''

''لگتا ہے کہ سب کچھ خوابوں کی اُدھوری داستان ہے۔ ہم خوابوں کے شہزادے حقیقت کی

پت جھڑ میں جیسے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ شاید اسی اُدھورے پن میں ہی زندگی کا راز ہے۔''

''لیکن تیرا راز تو وہ ایجڈ کرسچین ہے ناں؟''

''تم غلط سوچ رہی ہو۔ کوئی بھی کسی کو نہیں سمجھ سکا ہے۔ اس غلط فہمی کی دُوری کے لیے پتہ نہیں کتنے جنم چاہئیں اور پتہ نہیں یہ جنم جنم کے چکر اور مسافتیں بھی پوری پڑ سکتی ہیں کہ نہیں؟''

''تم نے کیا سوچا ہے؟''

''کس کے متعلق؟''

''آنے والے وقت کے متعلق۔''

''مستقبل کی عمارت کی تعمیر ماضی کی بنیادوں پر ہوتی ہے اور میرا ماضی تمہاری چاہتوں اور مسکراہٹوں سے بندھا ہوا ہے۔''

''لیکن۔ لیکن۔۔۔۔۔''

''مجھے پتہ ہے کہ تم زندگی کے راستہ میں اس شجر کی طرح ہو جو اپنا سب کچھ کبھی کا وقت کے طوفان میں گنوا چکا ہے، ساون رُت بھی جس کی پیاس بجھا نہ سکی ہے۔''

''اب ان باتوں سے کیا حاصل؟''

''محبتوں کے الاؤ میں پہاڑ بھی بھسم ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کوئی پو پھٹے کا وقت شام جیسا دکھائی دیتا ہے اور کیوں کبھی بسنت بہار میں پت جھڑ کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔''

''میں نے تم سے آئندہ کے متعلق پوچھا تھا؟''

''آئندہ کا پوچھتی ہو تو سنو! زندگی کے آنے والے وقتوں میں جو بھی وقت گزرے گا، اس تمہاری باتوں اور یادوں کے حوالے ہوں گے اور جب چاند ستارے اور ساون سولہ سنگھار کریں گے، تبھی مَن کے آنگن میں تیرے نہ ہونے کی آگ جلی ہوئی ہوگی۔ میں ہر گلی اور ہر موڑ پر تیرے لیے بے چین اور اُداس ہوں گا۔ تم اس لیڈی انسٹرکٹر کا طعنہ دیتی ہو لیکن میں نے تو تمہیں اس پتھر دل آدمی کے متعلق الف تک نہ کہا، وہ جو تیرا اپنا ہوتے ہوئے بھی تیرے احساسات کو سمجھ نہ سکا؟''

اسے یوں لگا جیسے دوسری طرف کوئی نہیں اور وہ خوامخواہ بولے جا رہا ہو۔

اس نے تھکے اور کمزور آدمی کی طرح ریسیور کو آہستگی کے ساتھ کریڈل پہ رکھ دیا۔

☆☆☆

وفا صالح راجپر، سندھی سے ترجمہ: ننگر چنا

نئی رکھیل

''ہاں، یہ لو پیسے۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔''

''آپ پیسے اپنے پاس رکھ لیں، مجھے ضرورت نہیں۔''

''کیوں؟''

''بس۔ میں نے کہا ناں کہ پیسے اپنے پاس رکھ لیں۔''

''لیکن کیوں؟ پچھلی مرتبہ بھی آپ نے پیسے لینے سے انکار کیا اور آج بھی۔''

''ہاں۔ اس دن بھی میں نے انکار کیا تھا اور آج بھی اور میں آئندہ بھی آپ سے پیسے نہیں لوں گی۔''

''تو پھر تمہارا جہان کیسے چلے گا؟''

''جیسے بھی چلے۔ آپ کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''

''کیا میری طرح کے اور بھی گاہک ہیں؟''

''ہاں صرف ایک تھا۔ اسے بھی کل چلتا کر دیا، ہمیشہ کے لیے۔''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں کیوں۔ جب سے آپ سے شناسائی ہوئی ہے تب سے کوئی دوسرا اچھا ہی نہیں لگتا۔''

''پھر تو آپ کو پیسے لینے ہی پڑیں گے۔''

''نہیں بالکل نہیں۔ مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو پھر کس چیز کی ضرورت ہے۔''

''مجھے صرف آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کو شاید آپ کے دوست نے نہیں بتایا کہ میں نوکری کرتی ہوں۔''

''نہیں۔ اس نے مجھے آپ کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ میں نے اسے کسی کبوتری کو شکار کرنے کے لیے کہا جو کہ تم ہو۔ خیر۔ چھوڑیے ان باتوں کو۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کیا کرتی ہیں؟''

''ہسپتال میں نرس ہوں۔''

''سنیے! آپ کا نام؟''

''کیوں؟ کیا آپ کو میرے نام کا پتہ نہیں ہے؟''

''نہیں۔ میں نے آپ سے پوچھا بھی تو نہیں ناں۔''

''میرا نام خالد ہے۔ سب دوست مجھے پیار سے خالو کہتے ہیں۔''

''آدھا نام لینے پر آپ کو غصہ نہیں آتا؟''

''نہیں۔ مجھے کوئی غصہ نہیں آتا۔''

''کیوں؟''

''پیار سے پکارنے والوں پر غصہ کیوں آئے گا؟''

''میرا نام یاسمین ہے۔''

''مجھے پتہ ہے۔''

''سنیے!''

''جی کہیے۔''

''میں آپ کو کس نام سے پکاروں؟''

''آپ کی مرضی ہے۔''

''میں آپ کو اس پیار والے نام سے پکاروں گی، خالو کے نام سے۔''

''ایک سوال پوچھوں؟''

''بالکل پوچھو۔''

''میں نے سنا ہے کہ آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے؟''

''ہاں۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔''

''سبب؟''

''سن کر کیا کرو گی؟''

اس نے کاندھے جھٹکتے ہوئے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''بس، پتہ نہیں کیوں آج میرا دل آپ سے گپ شپ کرنے کو کر رہا ہے۔''

''گپ شپ لڑانے کے لیے اور بہت سارے موضوع ہیں۔''

''کیوں؟ کیا شادی والا موضوع آپ کو اچھا نہیں لگتا؟''

''میں نے کب کہا کہ خراب ہے۔''

''پھر بتائیے کہ آپ نے کس وجہ سے اب تک شادی نہیں کی ہے؟''

''میں جس سے محبت کرتا تھا وہ میری ہو نہ سکی؟''

''آپ کو اس جذباتی فیصلہ کرنے پر کوئی پچھتاوا نہیں؟'' وہ کچھ حیرت زدہ سی تھی۔

''نہیں۔ پچھتاوا کس بات پر۔''

''خالو! میرا دل کہتا ہے کہ میں آپ سے شادی کروں۔''

''یہ ممکن ہے؟''

''کیوں نہیں۔ مجھ میں کیا کمی ہے؟''

''میں نے کہا ناں کہ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ شادی ہرگز نہیں کروں گا۔''

''لیکن خالو میں تم سے پیار کرتی ہوں، مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ اتنی محبت کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں اب تیرے بن نہیں رہ سکتی۔ تم میری زندگی ہو۔''

''میں تمہاری زندگی سہی لیکن میں تم سے شادی کسی بھی قیمت پر نہیں کر سکتا۔''

''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''ہاں یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''خالو! اگر یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے تو پھر میں نے بھی ایک فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی دوسرے کی دلہن بننے کی بجائے اچھا ہے کہ ہمیشہ کے لیے تمہاری رکھیل بن کر رہوں۔'' وہ آگ بگولا ہو کر چلی گئی۔

میں دو دن بعد بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، ابھی چند سرخیاں ہی پڑھ پایا تھا کہ ندیم آ پہنچا۔ اس کا چہرہ وفورِ مسرت سے کنول کی طرح کھلا ہوا تھا، خوشی لہریں سمندر کے مانند ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اتنا خوش دیکھ کر میں نے پوچھا، ''ندیم! آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔ نوکری مل گئی کیا۔''

''نہیں، یار! نوکری نہیں بلکہ چھوکری مل گئی ہے۔''

''تو کیا وہی لڑکی مل گئی جس کا تم اکثر ذکر کرتے تھے؟''

''ہاں، خالو! وہی لڑکی ہے۔''

''لیکن تم تو کہتے تھے کہ اس نے تمہارے ساتھ کبھی محبت کا اظہار تک نہ کیا تھا، پھر شادی کے لیے کیسے راضی ہوگئی؟''

''وہ نہیں ہوئی۔''

''تو پھر کون ہوا؟''

''لڑکی کے گھر والے۔''

''کرتی کیا ہے۔''

''نرس ہے۔''

''تو پھر کب ملواتے ہو ہم سے۔ دیکھیں تو سہی کہ آپ کی پسند کیسی ہے؟''

''آج ہی ملواتا ہوں آپ سے۔''

اس نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر مجھے تھماتے ہوئے کہا، ''یہ ہے میری پسند اور آپ کی ہونے والی بھابھی۔''

میں تصویر دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا اور کچھ بھی نہ بول سکا۔

شاکر حسین شاکر

رضی الدین رضیؔ کی ذات کے گنجھل

رضی میرا ہم زاد ہے۔ اس کے جتنے دُکھ، سُکھ، خوبیاں، خامیاں، پیار اور عذاب ہیں وہ اس کے نہیں بلکہ میرے ہیں۔ وہ شاعری کرتا ہے اور خوبصورت شاعری سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیتا ہے۔ کالم لکھے تو پڑھنے والے ''ڈرتے ڈرتے'' اس کا لکھا ہر جملہ پڑھتے ہیں کہ اس کے قلم کی کاٹ تلوار سے کہیں زیادہ گہری ہوتی ہے۔ میرا اور رضیؔ کا ساتھ کتنا پرانا ہو گیا ہے۔ یہ باتیں اب حساب کتاب لگانے کی نہیں ہیں۔ البتہ آپ کو ایک بات بتانا ضروری ہے کہ اِس کی میری آخری لڑائی صدام حسین کی پھانسی والے دن ہوئی اور وہ لڑائی اتنی شدید تھی کہ بس میری دکان میں توڑ پھوڑ نہیں ہوئی۔ ورنہ تلخ و تیز گفتگو کے اتنے نشتر چلائے گئے کہ اگر اُس دن قمر رضا شہزاد جیسا بُردل دوست صلح نہ کراتا تو اب تک ہم لڑ ہی رہے ہوتے۔

رضیؔ کے غصے سے کون واقف نہیں۔ گھر سے لے کر دوست اور دوستوں سے لے کر دفتر کے کولیگ سب ہی اِس کے مزاج کو جانتے ہیں۔ وہ بچپن میں جیسا تھا آج بھی ویسا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ خیال تھا شادی کے بعد رضیؔ تبدیل ہو جائے گا، لیکن رضی نے تبدیل نہ ہونے والا چولا پہن رکھا ہے۔ اس کے بالوں کا رنگ بدل گیا ہے، لیکن اس نے خود تبدیل نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے۔ لوگ موٹر سائیکل کا ماڈل بھی پانچ چھ سال بعد بدل لیتے ہیں۔ اِس معاملے میں وہ ڈاکٹر عاصی کرنالی کی تقلید کر رہا ہے یعنی عاصی صاحب کی طرح اس نے بھی ارسطو کے زمانے کا موٹر سائیکل رکھا ہوا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں کچھ کام بڑی تیزی سے کرتا ہے۔ چائے بڑی تیزی سے پیتا ہے۔ گالی کا جواب گالی سے دیتا ہے۔ دوستوں کے درمیان اگر چپ بیٹھا ہوا ہے تو کوئی اس کو بولنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر وہ بول رہا ہو تو اس کو چپ کرانا بڑا مشکل ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے اس کی شخصیت میں گنجھل پڑے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی اس کی شخصیت کی گتھیاں سلجھانا چاہتا ہے تو اس کی انگلیاں تھک جاتی ہیں، لیکن رضی کی شخصیت کے گنجھل نہیں کھل پاتے۔ رضی کیسا ہے اس کے بارے میں وہ خود کہتا ہے:

> ''جنوری کی ایک ٹھٹھرتی صبح سورج ابھی نصف النہار پر نہیں آیا تھا۔ ملتان چھاؤنی کے بابو محلے میں واقع ایک سہ منزلہ مکان کے صحن میں ایک جنازہ پڑا تھا۔ گھر میں کہرام تھا اور اِس سارے کہرام سے بے خبر ایک ساڑھے تین سالہ بچہ جنازے کے پاس کھیل رہا تھا۔ وہ حیرت سے کبھی جنازے کو اور کبھی رونے والوں کو دیکھتا اور پھر دوبارہ کھیل میں مگن ہو جاتا۔ ساڑھے تین سالہ بچہ جو اِس بات سے بے خبر تھا کہ اس کے کھیلنے کے دن ختم ہو گئے ہیں مگر وہ کھیل رہا تھا، لیکن خاموشی کے ساتھ پھر وہ اِس کہرام اور چیخ و پکار سے گھبرا گیا۔ گھبراتا کیوں

نہ اسے بین کرنے والی عورتوں نے باری باری اپنے سینے سے لگا کر رونا جو شروع کر دیا تھا۔''

جی ہاں یہ رضیؔ کی زندگی کا آغاز تھا۔ جب اس کے کھیلنے کے دن چل رہے تھے۔ وہ تب سے لے کر آج تک اُس جنازے کے کہرام کو نہیں بھولا۔ اسے آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جنازہ اس کے سامنے رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ جب میرے سامنے طفیل ابن گل کے مرنے کی بات کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے طفیل یہاں سے جاتے ہوئے رضی کا کچھ حصہ بھی ساتھ لے گیا ہے۔ قمر الحق قمر کے مرنے کی خبر اُس نے میرے سامنے موبائل فون پر سنی اور موبائل فون بند کرنے سے پہلے رضی دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ مرزا ابنِ حنیف سے جب ہم آخری بار ملنے گئے تو موت اُن کے چہرے سے عیاں تھی۔ رضی ان کے گھر سے نکلا اور نکلتے ہی رونے لگا کہ آج کے بعد ہم مرزا صاحب سے گپ شپ لگانے نہیں آیا کریں گے۔ نوائے وقت کے نثار احمد اختر کی موت تو ملتان سے باہر ہوئی، لیکن رضی ان کی یادوں کا جنازہ لے کر تین دن تک گھر میں بیٹھا رہا اور روتا رہا۔

رضیؔ کی شخصیت کا یہ روپ پہلی بار سامنے آیا ہے۔ وہ بظاہر جتنا کرخت دکھائی دیتا ہے رفتگانِ ملتان کی اشاعت کے بعد معلوم ہوا وہ کتنا ملائم ہے۔ اس کے غصہ کا سبب یہی ہے کہ اس نے ساڑھے تین سال کی عمر میں کھلونوں کی بجائے اپنے صحن میں جنازہ دیکھ لیا تھا۔ جس عمر میں ماں زرق برق کپڑے پہنتی ہیں اس کی ماں نے رنگوں کو خیر باد کہہ دیا۔ ضد کرنے اور فرمائش کرنے کی عمر میں رضی اپنی فرمائش اور ضدیں دبا کر خاموش ہو گیا۔ آخر کار وہی ہوا جب رضی کے بولنے کی عمر آئی تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ رضی بڑا اکڑو ہے۔ بہت غصہ رکھتا ہے، مغرور ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ رضی تو ہمارے شہر کا وہ مان ہے جس نے لوگوں کے دُکھوں کو اپنے دُکھ کے اندر سمویا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں رضی اُن کو یاد رکھتا ہے۔ اسلم یوسفی کی موت پر ملتان میں صرف دو مضمون لکھے گئے جن میں ایک رضی نے لکھا۔ اسی طرح نثار احمد اختر، امیر علی شاہ اور ضیغم شمیروی ایسے لوگ ہیں جن کو صرف رضی نے یاد رکھا۔ رفتگانِ ملتان جس نے بھی پڑھی اس نے کہا رضی یہ تم نے کیا لکھ دیا۔ رضی جن دنوں یہ کتاب لکھ رہا تھا ان دنوں دیر تک یہ روتا رہتا۔ کتاب کمپوز ہونے گئی تو کمپوز ر ایک لائن کمپوز کرتا اور رو پڑتا۔ پرنٹنگ پریس والا کہنے لگا شاکر صاحب ایسی کتاب میں دوبارہ شائع نہیں کروں گا۔ میرے ملازم اس کتاب کا پہلا جنازہ پڑھتے ہی اپنے والد کی قبر بنوانے چلے گئے ہیں۔ بک بائنڈر نے مجھ سے کہا رضی سے کہنا انہوں نے اپنے والد پر جس طرح کا مضمون لکھا ہے وہ مضمون پڑھ کر ہم اپنے والد کے لیے بہت روئے ہیں حالانکہ ہم اہلِ حدیث ہیں اور ہم نے کبھی اپنے والد مرحوم کو اِس انداز میں یاد نہیں کیا تھا۔ غرض یہ ہے کہ رضی کی یہ کتاب ایسی ہے کہ ہر پڑھنے والے کا جی چاہتا ہے کہ رضی کی زندگی میں اسے موت آئے سو رضی تم فن کی ایسی بلندی پر پہنچ گئے ہو کہ تمہارے پیارے اپنے مرنے کی اور تمہارے جینے کی دعا کرتے ہیں۔ ایسی دعا رضیؔ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

قمر رضا شہزاد

ایک سنگدل شخص کی کہانی

سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ میں اور رضّی مقامی ہوٹل کے باہر دھری کرسیوں پر بیٹھے چائے پینے میں مصروف تھے۔ دنیا جہان کی خوش گپیاں چل رہی تھیں۔ اچانک اُس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ رضّی نے نمبر دیکھا اور اُس کے چہرے پر ناگوار تاثرات اُبھرے، کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی۔ آخر اُس نے موبائل اپنے کان سے لگالیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد رضی نے سوال کیا۔ کتنی ہلاکتیں ہوئیں۔ دوسری طرف سے آنے والا جواب شاید رضی کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس لیے اُس کے چہرے کے تاثرات مزید ناگوار ہوگئے اور وہ کہنے لگا چھوڑو یہ بھی خبر ہے اتنا بڑا دھماکہ اور محض ایک ہی شخص زندگی سے محروم ہوا کم از کم پندرہ بیس افراد تو مرنے چاہیے تھے۔ رضی کا یہ سنگ دلانہ جواب میرے لیے افسوس ناک تھا۔

رضی تمہیں شرم نہیں آتی تم کتنے ظالم ہو محض ایک چھوٹی سی خبر کے لیے تمہیں ڈھیروں جانوں کا نذرانہ درکار ہے۔ میں نے غصے سے کہا۔ رضی ڈھٹائی سے ہنسا اور کہنے لگا بھائی کیا کریں ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ ہم تو دن چڑھتے ہی حادثوں کی دعا کرنے لگتے ہیں تاکہ اگلی صبح اخبار کو زیادہ سے زیادہ گاہک میسر آسکیں۔ رضی خدا سے ڈرو ایک دن تمہیں بھی یہ جہان چھوڑنا ہے۔ میں نے کہا چھوڑ دیں گے بھائی اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جس اخبار کے لیے ہم چھ چھ کالم کی خبر کی تلاش میں رہتے ہیں وہ ہماری موت کی خبر شاید سنگل کالم میں بھی شائع نہ کرے۔ رضّی نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

رضی اور میرا یہ مکالمہ گاہے بگاہے رہتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا اخبار کی دنیا میں رہنے والا رضی کہیں بے حس تو نہیں ہوگیا۔ کیا تمام اخبار نویس ایسے ہوتے ہیں؟ ہاں ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

☆

موسمِ گرما کی ایک تپتی دوپہر میں دفتر سے گھر جانے کی بجائے ملتان آدھمکا۔ شاکر حسبِ معمول حساب و کتاب کی دنیا میں مصروف تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے آنکھ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ شاکر کی اِس سرد مہری کا میں عادی ہوگیا تھا۔ لہٰذا رنجیدہ ہونے کی بجائے میں نے رضی کی بابت سوال داغ دیا۔ رضی آئے گا؟

نہیں وہ آج نہیں آسکے گا۔ شاکر نے جواب دیا۔

کیوں؟

اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔

اُسے کیا ہوا۔ میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔

اُس کی ایک آنکھ کی تقریباً ۶۰ فیصد روشنی کم ہوگئی ہے۔

نہیں یہ کیسے ہوا میں مزید پریشان ہوگیا۔

ابھی شاکر سے میری گفتگو جاری تھی کہ سامنے سے رضی آتا ہوا دکھائی دیا اور اُس نے آتے ہی حسبِ معمول گرمجوشی سے مجھے گلے لگالیا۔

رضی خیریت ہے؟

کیوں کیا ہوا؟ رضی نے پوچھا۔

تمہاری آنکھ ابھی میں نے بات مکمل نہیں کی تھی۔

رضی زور سے ہنسا اور کہنے لگا بھائی اب ہم سب کو ایک آنکھ سے دیکھیں گے۔

خدا نہ کرے۔

کسی اچھے آئی سپیشلسٹ سے مشورہ کیا ہے؟

کیا ہے۔

ایک تو وہ کہتا ہے اس کے علاج پر رقم بہت لگے گی اور دوسرے اِس کے درست ہونے کے امکانات بھی بہت کم ہیں؟

رضی نے جواب دیا۔

کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کرلیتے؟ میں نے کہا۔

بند کرو اپنی بکواس اور چلو چل کر چائے پیتے ہیں۔ رضی نے جواب دیا۔ کیا رضی تم اپنے لیے بھی اتنے ہی سنگ دل ہو۔ میں نے پوچھا ہاں ایسا ہی ہوں۔ رضی نے کہا۔

تم نہیں سُدھرو گے۔ میں نے سٹپٹا کر کہا۔

☆

رضّی تمہاری یہ عمومی تصویر تمہارے اکثر ملنے جلنے والوں کے دلوں پر کندہ ہوچکی ہے۔ وہ تمہیں ایک سخت گیر، ضدی، بے حس اور ناراض نوجوان تصور کرتے ہیں اور شاید مجھے بھی کبھی کبھی ایسا ہی لگتا ہے کہ تمہیں اپنی یا کسی دوسرے کی کوئی پرواہ نہیں۔ تم کسی سے محبت نہیں کرتے۔ تمہارے بارے میں میرا یہ تصور تمہاری موجودہ تخلیقی کتاب ''رفتگانِ ملتان'' سے قبل تھا۔

رضی تمہیں نہیں خبر تمہاری موجودہ کتاب نے میری کتنی راتوں کی نیندیں برباد کردی ہیں۔ آنسو ہیں کہ تھمتے نہیں۔ خبروں کے لیے ہر لمحہ لاشوں کی تلاش میں رہنے والے رضّی تم کتنے مختلف ہو۔ مجھے اب پتہ چلا کہ کسی ایک شخص کی موت تمہیں کتنی دفعہ اندر سے مارتی ہے اور اِس کتاب میں تم نے جتنے

جنازے اُٹھائے ہیں وہ تمہارے اپنے وجود کے جنازے ہیں۔تمہارے والد کی موت ہوسکتا ہے تمہارے والد کی موت ہو،لیکن میرے خیال میں تمہاری اپنی موت کا دُکھ ہے اور یہ دُکھ جس سچائی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوا ہے شاید ہی اِس کی مثال تاریخِ ادب میں کہیں نظر آئے۔ یہ تحریر وہ تخلیقی معجزہ ہے جو کبھی کبھی رونما ہوتا ہے۔ یہ کتاب اہلِ دل کے لیے ایک نشست میں پڑھنا ممکن نہیں ہے۔شاید اِس لیے بھی کہ دل میں برسنے والی بارش کا پانی جب آنکھ میں آتا ہے تو آنکھ کے شیشے دُھندلا جاتے ہیں اور پھر پڑھنے والوں کا لفظوں سے رابطہ منقطع ہوجاتا ہے۔

رضی تمہاری تخلیقی صلاحیتوں پر تو مجھے کبھی شبہ نہیں رہا،لیکن ایک غلط فہمی جو تمہاری شخصیت کے بارے میں تھی وہ بھی دُور ہوئی کہ تم بہت مضبوط ہو۔تم بظاہر مضبوط دکھائی دیتے ہو،لیکن ایسے ہو نہیں۔ تمہارے سینے میں ایک ایسا نازک دل ہے جو ذرا سی ٹھیس برداشت نہیں کرسکتا۔تمہارے آنسو باہر نہیں برستے مگر تمہارے وجود کے اندر مسلسل بارش ہوتی رہتی ہے۔

نجانے کون سا قصہ بیاں کیا اُس نے
ہر ایک آنکھ سے دریا رواں کیا اُس نے
گلاب جیسے بدن کو سپردِ خاک کیا
چراغ جیسی نظر کو دُھواں کیا اُ س نے

☆☆☆

فرح ذبیح

رفتگانِ ملتان---ایک تجزیاتی مطالعہ

ملتان کے ممتاز صحافی، دانشور، ادیب شاعر، تاریخ نگار، کالم نگار، دس کتابوں کے مصنف رضی الدین رضؔی کی گیارہویں کتاب ''رفتگانِ ملتان'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ملتان کی مختلف شخصیات کی وفات پر لکھے گئے مضامین (کالم) ہیں۔ اِن مضامین کی تعداد چونتیس (۳۴) اور صفحات کی تعداد ۱۶۰ ہے۔اس کتاب کو کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان کینٹ نے دسمبر ۲۰۰۶ء کو شائع کیا۔اس کتاب کا انتساب مصنف نے اپنے محروم والدِ محترم کے نام معنون کیا ہے۔انتساب کے الفاظ یہ ہیں:

''شیخ ذکاءالدّین اوپل کے نام''
میں نے پہلا جنازہ اُن کا ہی دیکھا تھا۔''

اِن مضامین کے عنوانات اُن شخصیات کے حسبِ حال دیئے گئے ہیں جو اس کتاب کی دلچسپی اور انفرادیت کا باعث ہیں۔ اِس کتاب میں ملتان کے ادیب، شاعر، صحافی، مصور، دوست احباب کی شخصیت اور زندگی کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ یہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے ملتان کی تہذیب وثقافت کو زندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ملتان کی ادبی محافل کو زندگی اور اِن محافل کے روح رواں بھی تھے۔ یہ مضامین اِن مشاہیرِ ادب وفن کی اموات اور اُن کی برسی پر لکھے گئے تھے اور اخباری کالم کے طور پر مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔رضی الدین رضؔی نے ملتان کے اِس سرمائے کو کتاب میں محفوظ کر کے اُنہیں ہمیشہ کے لیے اَمر کر دیا ہے۔موت پر لکھے گئے مضامین کی اس کتاب کو لبادہ بھی سیاہ ماتمی پہنایا گیا ہے۔ کتاب کا ٹائٹل مٹیالے اور سیاہ رنگ سے ترتیب دیا گیا ہے اور اِن دو ماتمی رنگوں میں خوش خطی سفید کفن جیسے رنگ کی گئی ہے یہ موضوعات کے عین مطابق ہے۔ اِس کتاب کا دیباچہ ''موت کا پیش لفظ'' کے عنوان سے ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ

''میں یہ سمجھتا ہوں کہ مرنے والوں کو اگر ہم مردہ سمجھ لیں تو وہ مرجاتے ہیں،لیکن اگر ہم انہیں زندہ ہی سمجھیں اور اُن کی رفاقت کو قدم قدم پر محسوس کریں، تنہائی میں اِن سے باتیں کریں اور اِن کے ساتھ گزرے ہوئے ایک ایک لمحے کو ہر پل یاد کریں تو وہ کبھی نہیں مرتے۔''

اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اِس کتاب کا مطالعہ قاری کو اِسے کئی بار پڑھنے کی تحریک دیتا ہے۔ اِن مضامین کو پڑھنے سے تحریروں کی ہشت پہلو ہمہ جہتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بظاہر یہ

مضامین ہیں مگر قاری کو خاکہ نگاری، مضمون نویسی، افسانہ، کہانی، داستان، سوانح نگاری غرض سب رنگ چھلکتے نظر آتے ہیں۔ ان احساسات سے قطع نظر جو احساس دل کو چھو لینے والا ہے وہ یہ کہ مصنف موت کے احساس سے ایسی قربت رکھتا ہے ایسا لگاؤ ایسی اپنائیت ایسی دوستی اور ربط رکھتا ہے کہ جیسے یہ لمحے اُن پر بیتے ہوں اِن نوحہ نما شخصی خاکوں کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ ''یہ ملتان کے نوحے نہیں میری اپنی موت کی کہانی ہے''۔ یہ دوست، یار جو ہماری محافل کی رونق ہمارے دُکھ درد کے ساتھی تھے۔ زندگی سے ناطہ توڑ کر اپنے حصے کی تنہائی ہمارے دامن میں ڈال جاتے ہیں جو ہمیں زندگی سے دور اور موت سے قریب تر کر دیتی ہے۔ مصنف صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ حساس دل شاعر بھی ہے اور ہر حساس فنکار اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا نقطۂ نظر عصری سیاق وسباق کے فوری دباؤ سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اِردگرد کے واقعات، تجربات اور حالات سے وہ متاثر ہوتا ہے اور اُس کی سوچ مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے۔ رضؔی کا فن بھی اپنے عہد سے اُبھرا ہے اور اپنے عصری حالات کی روئیداد لیے ہوئے ہے اِن شخصیات کے نوحے میں معاشرتی ناہمواریوں، طبقاتی کشمکش، خودغرضی، بے حسی، بے مروتی کے ماتم کی سسکیاں صاف سُنائی دیتی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ایک سہ منزلہ مکان کے صحن میں ایک جنازہ پڑا تھا۔ جنازے کے گرد عورتیں بین کرتی تھیں۔ ایک میت تھی کہ جسے ابھی کفنایا نہیں گیا تھا اور اس کے چہرے پر لہو تھا۔ چیخ وپکار تھی اور آہ وپکار تھی۔ عورتوں کے دلخراش بین تھے۔ پورے محلے کی عورتیں صحن میں جمع ہو کر جوان موت پر آنسو بہا رہی تھیں۔ اِس گھر میں تین سال کے دوران یہ دوسری جوان موت ایک ۳۰ سالہ درزی کی موت جو ٹریفک حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔'' (پہلا جنازہ)

''پہلا جنازہ'' اس کتاب کا پہلا اندوہناک مضمون ہے جو کہ مصنف کے والدِ محترم کی دل دوز یادوں سے وابستہ ہے۔ بچپن کی یادیں دل پر ایسی نقش ہوتی ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں۔ ہماری شخصیت ہمارے مزاج بول چال میں اُن دلخراش یادوں اور باتوں کا عکس صاف دیکھا جا سکتا ہے اور جب یہ یادیں ہوں ہی دل سوز تو پھر وہ ہمارا سرمایہ ہو جاتی ہیں۔ مصنف کی موت سے محبت و رومانس کی اہم وجہ یہ ہے کہ مصنف ساڑھے تین سال کی عمر میں والد کے سائے سے محروم ہو گئے۔ والد جب سائیکل پر باہر جانے لگے تو رضؔی نے والد کے ساتھ جانے کی ضِد کی۔ والد نے کہا تھا ''بیٹا میں ابھی آتا ہوں تمہارے لیے ٹافیاں لے کر آؤں گا'' پھر اپنی شریکِ سفر سے کہا تھا ''آج آلو والے پراٹھے پکا لینا'' اور پھر ابدالی روڈ پر پریس کلب کے قریب ایک تیز رفتار بے رحم امیر زادے کی بے توجہی اور بے نیازی کا شکار ہو گئے۔ یہ ٹریفک حادثہ ۹ رجنوری ۱۹۶۸ء کو رونما ہوا جب مصنف کے والد کی گود میں لاڈ کرنے اور اُنگلی پکڑ کے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ یہ شفقت بھرا لمس مصنف سے ہمیشہ کے لیے دُور ہو گیا۔ گھر سے رخصت

ہونے کے ٹھیک دس منٹ بعد معصوم بچے کے لیے ٹافیاں تو نہ آئیں آنگن میں میت اور دردناک آہ وبکا کا منظر مصنف کی یادوں میں ثبت ہو کر رہ گیا کہ مصنف والد کا ٹافیوں کا کیا ہوا وعدہ ہر عید پر نبھاتا ہے۔

''حسن پروانہ قبرستان میں ایک قبر پر اِن کے نام کا کتبہ ہے۔ میں ہر عید کی صبح کا آغاز ان کی قبر پر اگربتیاں جلا کر کرتا ہوں اور واپسی پر کسی دکان سے ایک ٹافی لے کر اپنی جیب میں ڈال لیتا ہوں کہ ان کا وعدہ پورا ہو جائے۔'' (پہلا جنازہ)

مصنف نے بچپن کا وہ سانحہ ہر لمحہ اپنے جسم وجاں میں جذب کیے رکھا اور پھر موت سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ ہر دوست کی موت اُسے والد کی موت کی کربناکی کو تازہ کر دیتی۔ مصنف کا دل اس عارضی وفانی دنیا میں پھر لگ نہیں سکا کہ موت سے اُسے اب ڈر نہیں لگتا کہ یہ پیالہ کم سنی میں والد نے نوشِ جاں کیا تھا پھر اِس معصوم بچے کی اُٹھان میں بسنے والا ہر لمحہ زندگی سے دور اور موت کی طرف رواں دواں ہوتا ہے کہ جیسے موت سے اس کا پرانا ربط ہو۔ اس کتاب کی تقریب رونمائی میں ڈاکٹر عباس برمانی نے درست ہی تو کہا کہ ''اس کتاب میں موت کے ساتھ رضؔی کا رومانس قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔''

مصنف ''موت کا پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:

''موت میں پتہ نہیں کیا کشش ہے کہ یہ مجھے اپنی جانب بہت متوجہ کرتی ہے ایسا کیوں ہے؟ مجھے خود بھی اس کا علم نہیں اور نہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں لیکن موت کی طرف بار بار متوجہ ہوتا ہوں جیسے وہ میری محبوبہ ہو۔''

سچ تو یہ ہے کہ رضؔی صاحب کی یہ کتاب پڑھ کر موت سے محبت ہونے لگتی ہے کہ ہمارے پیارے جب اس جہانِ فانی سے گزر گئے تو ہم کیوں نہ جلد از جلد اس عارضی وفانی ٹھکانے کو خیرباد کہیں کہ اپنے پیاروں کی محفل میں ان کی قربت میں ان کے پاس پہنچ جائیں کہ زندگی تو مسلسل سفر کا نام ہے کہ

موت کو سمجھتے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی ، صبح دوامِ زندگی

مصنف نے اِس کتاب کے انتساب کے بعد خوبصورت شعر قلم بند کیا ہے جو مصنف کی موت سے محبت وکشش کی ترجمانی کر رہا ہے۔

دھمال ڈالتا جاؤں گا اُس کی جانب
جب ایک دن مری مٹی مجھے پکارے گی

رضؔی صاحب حساس دل رکھنے والے ہمدرد انسان ہیں اِن کے اس مجموعے میں شامل ہر مضمون کی سطر سطر کرب، دُکھ اور داخلی جذبے کی حرارت سے بھرپور ہے کہ ہر قاری محسوسات کے اس رشتے سے خود کو منسلک محسوس کرتا ہے۔ ایک مضمون میں انسانی رویوں کی بے حسی پر کڑھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک غریب خانہ بدوش کا ۷ سالہ بچہ زرعی آلات کی دکان کے باہر کاغذ چُنتے چُنتے

زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا ان آلات میں چوروں سے محفوظ رہنے کے لیے کرنٹ چھوڑا گیا تھا جو بچے کی موت کا سبب بنا۔''

دولت مندوں کی اس بے حسی کو مصنف نے کچھ یوں قلم بند کیا ہے:

''اس کے باپ نے اُس کی نعش اُٹھا کر جھگیوں میں رہنے والے خانہ بدوشوں کے ہمراہ ایک چھوٹا سا مظاہرہ کیا اور پھر اِسے قریبی قبرستان میں دفنا دیا۔ غریب کے بچے کی بھلا حیثیت ہی کیا ہوتی ہے اگر کوئی حیثیت ہوتی تو اپنی دکان کے باہر موت کا سامان رکھنے والے کو اُسی وقت گرفتار کرلیا جاتا اِس سے پوچھا جاتا کہ تم نے اپنی دُکان کے باہر ''قیمتی'' زرعی آلات میں کس قانون کے تحت کرنٹ چھوڑا تھا۔ سُنا ہے اب پولیس خانہ بدوش غلام کی صلح کروا رہی ہے۔ خانہ بدوش کی کسی سرمایہ دار کے ساتھ صلح کی بھلا حیثیت ہی کیا ہے اِسے ڈرا دھمکا کر کچھ رقم تھما دی جائے گی، رقم بھی کیا ہوگی ۱۰ ہزار ۲۰ ہزار یا زیادہ سے زیادہ ۲۵ ہزار اور گلی گلی کا غذ چننے والا اِس پر خاموش ہو جائے گا۔''

رضّی صاحب نے اپنے بزرگوں اپنے پیاروں اپنے دوستوں کی زندگیوں کے واقعات اور شخصیت کے چند پہلوؤں نہایت فصاحت و بلاغت سے ضبطِ تحریر میں لائے ہیں۔ ہر مضمون میں موت کی منظر کشی ایسے دل دوز اور پُر تاثیر انداز میں ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے جیسے اس منظر نامے میں وہ خود شریک تھا اُن کی ہر تحریر قاری کو اُداس کرتی ہے۔

''نشتر میڈیکل کالج کے گراؤنڈ کے ایک تاریک کونے میں مصور کا جنازہ رکھا تھا جنازے کے سرہانے گیس لیمپ اور اوپر آسمان پر چاند روشن تھا۔ لوگ سوگوار کھڑے تھے۔ اندھیرے میں کوئی شناسا آواز سُنائی دیتی تو سب اُس کی جانب لپکتے۔ تعزیت کے چند کلمے کہتے اور پھر خاموش ہو جاتے۔ گراؤنڈ کے ایک کونے میں واحد ٹیوب لائٹ جل رہی تھی جس کی روشنی تاریکی کو چیرنے کی کوشش کرتی اور پھر معدوم ہو جاتی۔ جنازے سے کچھ فاصلے پر دو درخت تھے۔ ایک کی شاخیں بانہوں کی طرح پھیلی ہوئی اور دوسرے کی آسماں کی جانب جیسے ایک درخت مرنے والے کو اپنی جانب بُلا رہا ہو اور دوسرا آسمان کی جانب ہاتھ اُٹھائے اس کے لیے دُعا مانگ رہا ہو۔ زوار حسین اگر زندہ ہوتے اور آج اُن کا جنازہ تیار نہ ہوتا تو وہ اس منظر کو اپنے کینوس پر ضرور منتقل کرتے اور اُن کی تصویر میں سیاہ رنگ نمایاں ہوتا۔'' (زوار حسین کی تصویر میں موت کا رنگ)

اس کتاب میں ملتان کی معاشرت کا پس منظر اور تمدنی روایات کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ہر

مضمون اپنے ماحول کے سماجی اور تہذیبی پہلوؤں کا عکاس ہے۔ ادبی محافل کی نشست و برخاست، ادیبوں کا رہن سہن، بود و باش اُن کی وضعداری و خوداری، علم دوستی دوستوں کی شب نوردی کی بھرپور نقشہ کشی کی گئی ہے۔

''حیدر گردیزی ملتان کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا محور تھے۔ اُن کے دم سے اس شہر کی محفلیں آباد تھیں۔ ملتان کے ادیبوں نے اُن کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا، یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے کہ ایک شخص کی موت کے نتیجے میں شہر کی ایک ادبی بیٹھک ہی ختم ہوگئی وہ جس ہوٹل میں محفل آراستہ کرتے تھے اور اِن کے دم سے جس ہوٹل کو ملتان کا پاک ٹی ہاؤس کہا جانے لگا تھا۔ شاہ صاحب کی موت کے بعد ادیبوں، شاعروں نے وہاں جانا ترک کر دیا۔ وہ محفلیں وہ قہقہے اور مشاعرے سب ماضی کا حصہ ہو گئے۔''

(حیدر گردیزی، موت سے پہلے آخری ملاقات کا اختتام)

اِن مضامین کا سب سے بڑا امتیازی وصف وہ اندازِ تکلم ہے جو پوری کتاب میں موجود ہے۔ رضّی کی عبارت آرائی میں ایسا اعجاز ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس کا اُسلوب اس قدر دلکش و دلنشیں ہے کہ قاری ایک ہی نشست میں پڑھ کر دم لیتا ہے۔ سادگی کے ساتھ فصاحت اور لطفِ بیان کو قائم رکھنا بڑا کمال ہے اور رضّی نے اِسے بخوبی نبھایا ہے۔ زبان کی قدرت کا بین ثبوت ہے کہ ہر حالت میں اور ہر موقع کے لیے الفاظ کا انتخاب موزوں، برمحل اور خوب ہے۔ اِن سنجیدہ اور علمی مضامین میں بے ساختگی، سلاست اور ادبیت کا ایک معیار قائم ہے جو شروع سے آخر تک تسلسل لیے ہوئے ہے۔

''وہ دن بھر ضلع کچہری میں وکالت کرتے مگر ہم نے انہیں کبھی اپنے بعض ہم عصروں کی طرح کسی کمشنر، ڈپٹی کمشنر یا ایے ڈی سی جی کی کاسہ لیسی کرتے نہیں دیکھا اور ہمیں یہ بھی یاد نہیں آتا کہ انہوں نے کبھی کسی تقریب میں کسی ''ادب نواز'' بیوروکریٹ کی شان میں کوئی قصیدہ نما مضمون پڑھا ہو۔ انہیں زمانہ سازی نہیں آتی تھی پھر بھلا وہ شہرت کی منازل کیسے طے کر سکتے تھے کہ فی زمانہ شہرت کی منازل طے کرنے سے پہلے منافقت اور خوشامد کی بھی بہت سی منازل طے کرنا پڑتی ہیں وہ ایک درویش انسان تھے اور درویش یونہی چلتے پھرتے اچانک منہ موڑ جاتے ہیں۔'' (شب نورد، منیر فاطمی)

رضّی صاحب کو یہ بھی رنج ہے کہ اِس خطے کے مشہور و معروف شعراء کا کلام مالی تنگدستی کے باعث شائع نہیں ہو سکتا کوئی ادارہ اس پر توجہ نہیں دیتا اِن شخصی خاکوں میں گاہے بگاہے بے حسی، بے مروتی اور بے توجہی جیسے رویوں کا ماتم کیا گیا ہے کہ ہم نے ملتان کے ادبی خط و خال نکھارنے والی شخصیات اور

اُن کے فن کو فراموش کر دیا ہے۔ کوئی ادارہ اس پر توجہ نہیں دیتا ہمیں اس خطے کے محسنوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور پھر ادبی محافل کے تاج دار جب رختِ سفر باندھتے ہیں تو بھی اُن کے جنازے میں ادباء کی شمولیت برائے نام ہوتی ہے۔ ان کی عبارت آرائی میں ہمارے ضمیروں کو جھنجھوڑنے اور اِن کوتاہیوں پر نظرثانی کرنے کی تنبیہہ بھی ہے کہ اس دنیا کی ہماہمی اور جھمیلوں سے فرصت نکال کر دُکھ درد کے ہمسفر احباب جب لحد کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں انہیں کاندھا کیوں نہیں دیا جاتا۔ شاید وہ موت کو اتنا قریب محسوس نہیں کرتے جتنا کہ ایک حساس دل رکھنے والا رضّی رکھتا ہے۔ بلا شبہ اُن کی تحریروں میں Message ہے کہ ہم خودغرض کیوں ہیں؟ ہم ایک دوسرے سے دُور کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟

''زکریا یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اس شہر کی ادبی تاریخ محفوظ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس شعبے کے زیرِ اہتمام اسلم یوسفی اور اِن جیسے اور بہت سے شعراء کے کلام کو بھی محفوظ کرنے کی کوشش کر لی جاتی۔ ایسے بہت سے شاعر جو مالی وجوہات یا بعض دوسری مجبوریوں کے باعث اپنی زندگی میں اپنا کلام شائع نہیں کرا سکتے اُن کی شاعری کو دریافت اور محفوظ کرنا ہمارا فرض ہے، چاہے ہم اِسے فرضِ کفایہ ہی سمجھ لیں۔''

(وضعدار اور خوددار اسلم یوسفی)

اس کتاب کے مطالعے سے مجھے احساس ہوا کہ صحافیوں کا الگ طرزِ زندگی ہوتا ہے اُن کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ وہ اپنے پیشے کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ پیشے سے محبت اور لگاؤ اُن کی سرشت میں شامل ہو جاتا ہے اور صحافیوں کی زندگیاں فرض شناسی اور حق وصداقت سے عبارت ہوتی ہیں۔ مصنف کے والد کی خبر اخبار میں معہ تصویر شائع ہوئی تھی۔ جب مصنف نے ہوش سنبھالا اپنی والدہ کے پاس اِسے محفوظ پایا وہ مصنف کے ذہن پر ایسی نقش ہوئی کہ جب بھی وہ موت کی خبر لکھتا ہے اُسے اپنے والد کی خبر یاد آتی ہے۔ شاید صحافت سے لگاؤ مصنف کو اس لیے بھی ہے کہ موت اور اخباری کالم دونوں مشروط ہیں کہ موت کا ربط اخبار سے ہے۔ جیسے ان کے والد کی موت کی خبر اخبار میں بنی تھی ویسے ہی دوسری خبریں چھپتی ہوں گی۔ اِن معمولات کی جزیات نگاری مصنف نے دل پذیر انداز میں کی ہے اور صحافیوں کی طرزِ زندگی کی عکاسی اِس انداز میں کی ہے کہ صحافیوں کی زندگی کا منظرنامہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ فرض شناسی اور صحافت سے لگاؤ کی وجہ بھی شاید والد کی خبر ہے جو انہوں نے پورے شعور میں آنے کے بعد محفوظ شدہ اخبار میں پڑھی:

''یہ سوال میں نے بار بار سوچا وہ خبر کس نے بنائی ہوگی؟ کہ خبر کتنی ہی اندوہناک کیوں نہ ہو اِسی ماحول میں بنتی ہے۔ ہم اخبار نویس بھی گورکن ہی تو ہوتے ہیں۔ نعشیں گن گن کر اور سیاہ حاشیے لگا لگا کر بے حس ہو جاتے ہیں یا پھر شاید

اتنے دُکھ سمیٹتے ہیں کہ ہمارے لیے ہر نعش پر آنسو بہانا ممکن ہی نہیں رہتا۔ آنسو بھی تو ایک حد تک بہتے ہیں نا پھر اس کے بعد تو آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں بس دل بھیگتا ہے۔ تو پھر میں سوچتا ہوں کہ جس نے بھی یہ خبر سنائی ہوگی کیا اُس نے یہ سوچا ہوگا کہ وہ جو یہ غیر اہم سی خبر بنا رہا ہے یہ ایک ساڑھے تین سالہ بچے کے لیے کتنی اہم ہوگی۔ اتنی اہم کہ وہ برسوں بعد جب بھی کسی لائبریری میں اخبارات کی فائلیں دیکھے گا تو اُن میں سے جنوری ۱۹۶۸ء کی فائل ضرور تلاش کرے گا اور ہر بار اپنے باپ کی خبر اور نعش کی تصویر اس طرح دیکھے گا کہ جیسے یہ حادثہ ابھی اسی لمحے ہوا ہو۔'' (پہلا جنازہ)

''خان رضوانی ایک ہمہ جہت انسان تھے۔ ان کی موت نے صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور سیاسی کارکنوں سبھی کو رنجیدہ کر دیا۔۔۔۔ بہت عرصہ کے بعد کسی ایسی شخصیت کا جنازہ دیکھا جہاں ہر شخص واقعی غمزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دوستوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور کچھ ضبط کیے ہوئے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ صاف ستھری صحافت کرنے والے خان رضوانی نے اگر کوٹھیاں، کاریں اور بنگلے بنا لیے ہوتے تو شاید آج ہر آنکھ اس کے لیے اس طرح نم نہ ہوتی۔'' (خان رضوانی کے لیے آنسو)

رضّی صاحب سے میری یادِاللہ زیادہ پرانی نہیں بس فون پر ہی تعارف ہوا تھا۔ میں نے پوچھ لیا۔ رضّی صاحب میرا مضمون موصول ہوا؟ انہوں نے جواب دیا جی وصول کر لیا۔ کب چھپے گا؟ انشاء اللہ اگلے جمعے آپ کا مضمون شائع ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ ان چند رسمی جملوں کی ملاقات میں مَیں نے اُن میں درد مندی اور خلوص محسوس کیا۔ ایسا خلوص جو کسی قریبی اور مخلص دوست میں محسوس کیا جاتا ہے اور فوراً اس پر اعتماد کر لیا جاتا ہے بعد ازاں انہوں نے مجھے ''رفتگانِ ملتان'' کی رونمائی پر مدعو کیا وہاں اِن پر پڑھے جانے والے تعریفی مضامین ایسے پیار، محبت اور اپنایت سے اُن کی زندگی اور مزاج کی نقاب کشائی کرتے گئے اور میں نے محسوس کیا کہ اِن سے چند لمحوں کی فون پر گفتگو سے جو اپنا پن میں نے محسوس کیا ہے۔ احباب ایک سچے اور کھرے دوست کی رفاقت سے کتنی طمانیت محسوس کرتے ہوں گے کہ آج کے دور میں رضّی جیسے ہمدرد اور احساس وانصاف کرنے والے دوست کہاں ہیں؟

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

جن لوگوں کو عام طور نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ رضّی صاحب نے انہیں یاد رکھا ہے انہوں نے منفرد اور اہم موضوع پر لکھ کر ملتان کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ انہوں نے ملتان کی تاریخ کا ایک

باب رقم کیا ہے۔ ان شخصی خاکوں میں اس عہد کی ذہنیت، سماجی تصورات اور معاشرت کے اہم مرقعے دستیاب ہوتے ہیں۔ انہوں نے خاکہ نگاری کی صنف میں نوحے کا رنگ شامل کیا ہے۔ اُن کی کتاب کا موضوع وہ اشخاص ہیں جن کے ہونے سے ملتان میں علم وادب کی بہت سی روایتیں زندہ تھیں۔ ان کے طرزِ تحریر سے احساس ہوتا کہ ایک شخص کی موت ایک عالم کی موت کے مترادف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ منفرد موضوع اور لب و لہجے کی ایسی توانائی ہے اس کتاب میں کہ ایک بار مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کتاب ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور قاری کو موت و زندگی سے یکساں ربط کا احساس دلاتی رہے گی۔ مصنف ''موت کا پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں ''موت ایک دم نہیں آتی یہ رفتہ رفتہ مکمل ہوتی ہے۔

> ''ہم آہستہ آہستہ مرتے ہیں۔ کسی پیارے کسی بزرگ یا کسی استاد کی موت ہمیں لحہ لحہ زندگی سے دُور کرتی جاتی ہے اور ہر صورت کے نتیجے میں ہمارے کچھ معمولات ہم سے چھِن جاتے ہیں۔ ہماری محفلوں کی رونق کم ہوتی ہے۔ ہم کچھ منظروں، کچھ چہروں اور کچھ آوازوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہر دوست بچھڑتے وقت ہمارے دامن میں اپنے حصے کی ایک تنہائی ڈال جاتا ہے وہ وقت جو ہم اس دوست کے ساتھ گزارتے تھے وہ ہم کسی اور کے ساتھ نہیں گزار سکتے۔ ہم ہر دوست کی موت پر ایک نئی کہانی کا شکار ہوتے ہیں اور یہ بہت سی تنہائیاں مل کر رفتہ رفتہ ہمیں بالکل تنہا کر دیتی ہے پھر ہمیں قبر کی تنہائی نصیب ہوتی ہے۔ یوں موت کا عمل مکمل ہوتا ہے۔''

واقعی موت کا عمل آہستہ آہستہ ہماری زندگیوں میں سرعت کرتا رہتا ہے۔ جب بہت سے اپنے جُدا ہوتے ہیں تو پھر ہماری باری آ جاتی ہے۔ رضؔی کا یہی فلسفہ اگر عام زندگی پر لاگو کیا جائے تو بھی زندگی کی حقیقت سمجھ آ جاتی ہے۔ جب ہر انسان غمِ دوراں سے دوچار رہتا ہے تو آہستہ آہستہ اِن صعبتوں، مصائب و آلام کی گردش میں دراصل دھیرے دھیرے موت کے عمل کو مکمل کر رہا ہوتا ہے۔

اس کتاب کے پہلے صفحے پر بلھے شاہ کا صوفیانہ کلام قلم بند ہے۔ جو رضؔی کے مزاج کا ترجمان بھی ہے۔

میرا رانجھن ہن کوئی ہور
تخت منور بانگاں ملیاں
تاں سنیاں تخت لہور
عشقے مارے اینویں پھردے
جیوں جنگل دے وِچ ڈھور

رانجھا تخت ہزارے دا سائیں
ہیں اوتھوں ہو یا چور
بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں
گور پیا کوئی ہور

کتاب کی رونمائی کے دوران ڈاکٹر انوار احمد صاحب نے سچ ہی تو کہا تھا:

''رضؔی کی کتاب اُداس کرتی ہے۔''

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں نے محسوس کیا ہے۔ رضؔی نے زندگی کے بہت دُکھ سمیٹے ہیں غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونوں سے نبرد آزما رہے۔ غم ہر دم اُن کی شخصیت میں سانس لے رہا ہے تب ہی تو وہ ہر غم، ہر دُکھ اور پھر موت تک سے جلد دوستی کر لیتے ہیں۔ اقبالؔ نے ایسے ہی تو نہیں کہا کہ ''غم بڑا مدرک الحقائق ہے۔''

اس کتاب میں تصاویر کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ ہر شخصی خاکے سے پہلے ممدوح کی تصویر بھی محفوظ کر لی جاتی تو اچھا تھا۔ قاری بین السطور ممدوحین کی قربت کا جو احساس محسوس کرتا ہے وہی احساس اُن کی شخصیت دیکھنے کا مشتاق بھی رہتا ہے۔

☆☆☆

خاور اعجاز

اگر تُو حلقۂ بزمِ نگاراں سے نکل جائے
تو شاید موسمِ دل باد و باراں سے نکل جائے

وہ عاشق کیا جسے رسوائی کا ڈر کھائے جاتا ہو
وہ شاعر کیا جو ''کوچۂ بلّی ماراں'' سے نکل جائے

تو پھر کس سمت میں جائے گا کچھ بھی کہہ نہیں سکتے
پرندہ اک دفعہ جب اپنی ڈاراں سے نکل جائے

یہاں تو آب و گِل اور باد و آتش کا تسلّط ہے
جیے گا وہ جو جتنی جلد چاراں سے نکل جائے

کہاں ممکن کہ لیلیٰ باغِ گُل افزا میں آ بیٹھے
کہاں ممکن کہ مجنوں دشتِ خاراں سے نکل جائے

☆☆☆

خاور اعجاز

اَب جنوں قابو میں آوے نہ پری آوے ہے
خاک اے دل تجھے پھر جادوگری آوے ہے

اے نسیمِ سحری! خط ہے نہ کوئی پیغام
تُو کہے تھی کہ تجھے نامہ بری آوے ہے

اور کوئی نہیں آوے ہے سرِ کوچۂ یاد
یاں خبر لینے فقط بے خبری آوے ہے

کہیں یہ ختمِ محبت کا اشارہ ہی نہ ہو
شمع اِک اور جو پانی پہ دھری آوے ہے

توڑ دیوے ہے بناتے ہوئے ہر بار مجھے
اور سمجھے ہے اُسے شیشہ گری آوے ہے

خاور اعجاز

ستم گری ہی وہ جانے نہ دلبری جانے
سو شہرِ عشق میں ہم اُس کو سرسری جانے

وہ شخص کیا کہ جو آئینہ ہی بنائے فقط
مگر نہ رازِ کمالِ سکندری جانے

نہ سقف و بام سلامت نہ اَب در و دیوار
ہمارے گھر کی جو حالت ہے بے گھری جانے

ہمارے جاننے والوں میں کون ہے شامل
یہ بات صرف جنوں جانے یا پَری جانے

ہم اپنے آقاؐ کے مشکور ہیں کہ جن کے طفیل
غلام بھی روشِ بندہ پروری جانے

خاور اعجاز

زمیں پہ آن رُکا آسماں سے ہوتا ہوا
یقیں تک آیا ہوں حدِّ گماں سے ہوتا ہوا

کھُلا مَیں اُس پہ اساطیر کے حوالے سے
وہ مجھ تک آیا مری داستاں سے ہوتا ہوا

ہَوا کا زور تو ساحل تک آن پہنچا ہے
سفینہ وار ہر اک بادباں سے ہوتا ہوا

مَیں تیرے رُوبرو خود چل کے آؤں گا اِک دن
ہر آزمائش و ہر امتحاں سے ہوتا ہوا

اُسی نواح میں پھر آن پہنچا ہوں آخر
گزر گیا تھا کبھی مَیں جہاں سے ہوتا ہوا

☆☆☆

خاور اعجاز

پوچھا مرا پتہ جو زمانے کی گرد سے
اِک خاک اور اُڑنے لگی راہِ درد سے

ہم اُس مقامِ شوق پہ آ پہنچے ہیں جہاں
منزل مزاج پوچھتی ہے رَہ نورد سے

دل کی مثال یوں ہے مرے ہم نفس کہ جُوں
اِک برگِ سرخ ٹوٹا ہوا شاخِ زرد سے

تُو نے ہمارا حال جو پوچھا تو بے سبب
شعلہ سا اِک لپکنے لگا آہِ سرد سے

کرتا ہے وہ حساب و کتابِ ستم گری
پورے معاشرے سے کبھی ایک فرد سے

خاور اعجاز

ایک دیے اور اِک محراب سے رشتہ رکھتا ہوں
اپنی آنکھوں، اپنے خواب سے رشتہ رکھتا ہوں

ویسے تو مَیں ہر امکان کے اندر بستا ہوں
لیکن صرف دلِ بے تاب سے رشتہ رکھتا ہوں

اِک دن خواب جزیرے پر پھر ظاہر ہوتا ہوں
صدیوں تک شہرِ غرقاب سے رشتہ رکھتا ہوں

مجھے سفر میں غوطے کھا کر چلنا آتا ہے
دریا ہوں اور ہر گرداب سے رشتہ رکھتا ہوں

تیرے ذکر سے روپ سجاتا ہوں تحریروں کا
اور تیرے رنگِ نایاب سے رشتہ رکھتا ہوں

ڈھالتا رہتا ہوں تیرے سانچوں میں اپنا آپ
یوں تیرے حسنِ آداب سے رشتہ رکھتا ہوں

ایک کنول کی صورت، اک مہتاب کے پیکر میں
جب تک ممکن ہو تالاب سے رشتہ رکھتا ہوں

☆☆☆

سیّد ضیاء الدین نعیمؔ

ہر قدم پر سامنے آتا ہے تازہ مسئلہ
روز کے اِن مسئلوں سے ہے نمٹنا مسئلہ

لائقِ توقیر ہم خود کو سمجھتے ہیں فقط
بس یہی ہے عہدِ حاضر کا سلگتا مسئلہ

دوسروں کے مسئلوں کو اہمیت دیتے نہیں
سامنے رکھتے ہیں اپنے صرف اپنا مسئلہ

ذہن اِک لمحے کو تو ماؤف ہو کر رہ گیا
رُوبرو رکھا ہمارے اُس نے ایسا مسئلہ

آدمی ہونے کے ناطے، احترامِ آدمی
عام ہو پائے تو حل ہو جائے سارا مسئلہ

جس بھلے انسان کو بے مسئلہ سمجھے تھے ہم
کر دیا اُس نے تو پیدا آج خاصا مسئلہ

ان غلط فہموں کے ہاتھوں زندگی مشکل ہوئی
آنکھ نَم کرنا مصیبت، مسکرانا مسئلہ

کوہ قامت ہو کے اِک دِن سامنے آیا نعیمؔ
ہم سمجھتے تھے جسے سادہ سا، چھوٹا مسئلہ

☆☆☆

سیّد ضیاء الدین نعیمؔ

یادیں دکھوں کا باب ہیں، ایک اعتبار سے
دل کے لیے عذاب ہیں، ایک اعتبار سے

ہے جن کے دم سے ایک بھی آنگن میں روشنی
وہ لوگ آفتاب ہیں، ایک اعتبار سے

یہ طفل، کھیلتے ہوئے ماؤں کی گود میں
کِھلتے ہوئے گلاب ہیں، ایک اعتبار سے

اپنوں سے چوٹ کھائے ہوئے دل بھی دوستو!
ٹوٹے ہوئے رباب ہیں، ایک اعتبار سے

ناکام جن کو کہتی ہے دنیا، وہ سادہ دل
دراصل کامیاب ہیں، ایک اعتبار سے

ہم سب رہینِ گردشِ ایّام ہیں نعیمؔ
ہم سارے ہم رکاب ہیں، ایک اعتبار سے

مشتاق شبنم

فضا فسردہ ہوا شکستہ
ہے ریزہ ریزہ صدا شکستہ
میں پا برہنہ میں پا شکستہ
ہوئی نہ میری اَنا شکستہ
پریدہ رنگ و پریدہ خوشبو
ہتھیلیوں پر حِنا شکستہ
شکستِ آئینہ کرنے والا
ہوا ہے خود خودنما شکستہ
چھپے گا آرائشوں میں کب تک
دردنِ دل جو ہوا شکستہ
دلوں کو روشن کرلے کہاں تک
اندھیرے گھر کا دِیا شکستہ
خلا کے ہموار راستے ہیں
زمین ہے جا بجا شکستہ
عذاب کیسا ہوا ہے نازل
شعور و فہم و ذکا شکستہ
چراغ عبرت نمائے منزل
ہے راہ میں نقشِ پا شکستہ
ستم ظریفی مصلحت ہے
زبان بریدہ ہے پا شکستہ
جہاں حقائق کی تلخیاں ہیں
ورق ہے تاریخ کا شکستہ
شناخت اپنی یہی ہے شبنم
نہ کیجئے عہدِ وفا شکستہ

☆☆☆

حصیرؔ نوری

سوچتا رہتا ہوں اکثر میں نے کیا سوچا نہیں
زندگی بھر میں رموزِ زندگی سمجھا نہیں

بے در و دیوار گھر ہے میرا ہر گھر سے جدا
اس مکاں کے بام و دَر میں کوئی بھی سایہ نہیں

صبح کی ٹھنڈی ہوا گزری ہے بے دستک دیئے
میں سرِ راہے کھڑا ہوں کوئی بھی اپنا نہیں

خود کہاں مجھ کو گوارا ہے مجھے اپنی خوشی
میرے اندر جھانک کر تم نے کبھی دیکھا نہیں

چیختا ہوں اپنی ہی ویرانیوں کو دیکھ کر
ورنہ میرے شہر میں اتنا بھی سناٹا نہیں

زاویہ میری محبت کا بہت ہی خاص ہے
عام لوگوں کی طرح تجھ کو کبھی سوچا نہیں

تھوڑی سی جرأت سے میں محروم ہوں کیونکر حصیرؔ
کھولنا چاہا تھا یہ عقدہ مگر کھلتا نہیں

حصیرؔ نوری

پہن کر دھوپ بادل جب سروں پہ مہرباں ہوگا
خلاؤں پر زمیں ہوگی زمیں پر آسماں ہوگا

ابھی تو آہ کے شعلوں سے تیرا ہاتھ جھلسا ہے
مرے ہی آنسوؤں سے جسم بھی جل کر دھواں ہوگا

مرے سوزِ دروں پہ آبِ ہمدردی کے چھینٹے دو
نہیں تو میرے اندر آگ کا دریا رواں ہوگا

مرا تو روشنی کے شہر سے دیرینہ رشتہ ہے
اندھیروں کے پرستاروں کا لیکن امتحاں ہوگا

درندے جنگلوں کو چھوڑ کر شہروں میں آئے ہیں
جو اَب ہوگا یہاں وہ جنگلوں میں پھر کہاں ہوگا

جہاں اک انفرادی سانحہ تکمیل پایا ہے
عزائم سے وہاں معمور ہر اک ناتواں ہوگا

حصیرؔ اس کے رویے پر اگر کچھ بھی کہا تم نے
مجھے معلوم ہے سن کر وہ تم سے بدگماں ہوگا

☆☆☆

ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ

خود کو تُو نمرود نہ شداد کر
اے شہِ مغرور کم بیداد کر

بے کسوں کی بد دعا سے خوف کھا
مفلسوں کے قلب مت ناشاد کر

صرف اپنوں پر خزانے مت لُٹا
ہر ضرورت مند کی امداد کر

سیکھنے ہیں علم ہستی کے اگر
تو زمانے کو فقط اُستاد کر

یہ پرندے تو فضا کا حُسن ہیں
کچھ خدا کا خوف اے صیّاد کر

دشمنوں سے بھی نمٹ لینا کبھی
تُو ابھی اس جسم کو فولاد کر

بھول جا نفرت کی سعدیؔ بولیاں
بس محبت کے سبق کو یاد کر

☆☆☆

ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ

بلا کی آندھیوں میں جل رہا ہے
دیا جس کو خدا کا آسرا ہے

دھڑکتا ہے ہزاروں زخم کھا کر
ذرا سے قلب میں کیا حوصلہ ہے

بڑھاتی ہے بشر کی خودسری کو
اَنا اَب ہر بشر کا مسئلہ ہے

بدلنے لگ گیا ہے وقت مجھ کو
مجھے بھی مصلحت نے آ لیا ہے

نہیں ہے اب محبت کی تمنا
مرا یہ شوق پورا ہو گیا ہے

بڑا مکّار ہے دشمن وفا کا
دلوں کے ساتھ سازش کر رہا ہے

تمہارے پاس کیا رکھا ہے سعدیؔ
تمہارے پاس بس جھوٹی اَنا ہے

توقیر تقی

یہ کیا ہوا کہ جنوں اختیار کرتے ہی
غبار ہو گئے صحرا کو پار کرتے ہی

نئے جہانوں کی تکوین کرتے رہتے ہیں
بس ایک یاد کو اپنا مدار کرتے ہی

یہ کون! دامنِ لطف و کرم میں رکھتا ہے
ہماری دولتِ گریہ شمار کرتے ہی

ہمیں نے روح میں زخموں کی آبیاری کی
ذرا سا دشتِ بدن لالہ زار کرتے ہی

شکاریوں کی نظر اب تمام دشت پہ ہے
ہمیں بصورتِ آہو شکار کرتے ہی

یہ کم نہیں پسِ دیوار چھپ کے روتے ہیں
یہ میرے لوگ مجھے سنگسار کرتے ہی

پھر آج اپنے ہی حجرے کو بے چراغ کیا
حلیف اپنا ہوا کو شمار کرتے ہی

پھر اس کے بعد نہ آنکھیں نہ دل نہ جاں تھی تقیؔ
ہمارا کچھ نہ رہا اُس سے پیار کرتے ہی

شارق بلیاوی

کروں میں استعاروں میں بیاں کیا
سمجھ لیں گے نہ وہ میری زباں کیا

نظر کو ہے فریبِ آسماں کیا
پسِ منظر بھی ہے منظر نہاں کیا

وہی ہونا ہے جو ہونا لکھا ہے
تو پھر ہنگامۂ سود و زیاں کیا

مرا ہر زخم مجھ سے پوچھتا ہے
کوئی ہوتا ہے یوں بھی مہرباں کیا

تقاضائے خودی ہے بے نیازی
جبینِ شوق کیا اور آستاں کیا

جنوں آثار ہے ماحول ہر سو
اسے کہتے ہیں نیرنگِ جہاں کیا

دُکھوں کا سلسلہ قائم ہے شارقؔ
نہ ہو گی ختم غم کی داستاں کیا

☆☆☆

پرویز ساحؔر

تا عمر مگر فکرِ خسارت نہیں کی
میں نے کبھی جذبوں کی تجارت نہیں کی

میں خواب میں اُس جسم کو چھُو سکتا تھا
صَد شُکر کہ میں نے یہ جسارت نہیں کی

اُس نے بھی وضاحت نہیں مانگی مجھ سے
مَیں نے بھی کوئی شرحِ عبارت نہیں کی

تجھ کو ابھی معلوم نہیں لذتِ دید
تُو نے کبھی اُس رُخ کی نظارت نہیں کی

مدت ہوئی ، خود سے بھی ملاقات ہوئے
مدت سے خود اپنی بھی زیارت نہیں کی

مانا کہ کئی عیب ہیں مجھ میں ، لیکن
میں نے کسی انساں سے حقارت نہیں کی

اُس نے بھی نہیں مجھ کو دریچے سے بلایا
میں نے بھی اُسے کوئی اشارت نہیں کی

یوں ہی تو نہیں اُس پہ فدا ہو گیا میں
یوں ہی تو یہ سب زندگی غارت نہیں کی

کب اُس نے نہیں مجھ کو ستایا ساحؔر
کب اُس نے مگر مجھ سے شرارت نہیں کی

☆☆☆

کاشفؔ مجید

محبت میں دلِ ناکام کی بھی زندگی ہے
جو کر پایا نہیں اُس کام کی بھی زندگی ہے

میں زندوں کے لیے کہرام کرتا ہوں کہ صاحب
مجھے معلوم ہے کہرام کی بھی زندگی ہے

یہاں میں اپنی مرضی سے مصیبت جھیلتا ہوں
یہاں میرے لیے آرام کی بھی زندگی ہے

ترا پیغام ہے سینہ بہ سینہ چلنے والا
مرے آقا ، ترے پیغام کی بھی زندگی ہے

مدینہ اس لیے بھی زندگی کا استعارہ
وہاں دیوار و سقف و بام کی بھی زندگی ہے

☆☆☆

کاشفؔ مجید

نام کا کیا ہے بھلے نام کو موت آجائے
ڈروا اُس وقت سے جب کام کو موت آجائے

باعثِ گردشِ ایّام فنا ہو پہلے
اور پھر گردشِ ایّام کو موت آجائے

اشک ہی اب تو حوالہ ہیں مرے ہونے کا
یہ نہ ہوں تو دلِ ناکام کو موت آجائے

دشت میں رہنے کے آداب اگر آجاتے
میں بھی کہتا کہ در و بام کو موت آجائے

میں نے دیکھی ہے یہاں زندگی ریزہ ریزہ
میں نہیں کہتا ہوں کہرام کو موت آجائے

پرویز ساحؔر

چھوڑو بھی یہ اپنی اِین و آں تو
کیا تم سے میں کہہ تھا ، ہاں تو

اب کون رہے گا میرے دل میں
خالی ہی رہے گا یہ مکاں تو

تیری یہ ادائے دلبرانہ
لے کر ہی رہے گی میری جاں تو

پھر کیوں یہ حجاب سا ہے ہم میں
گر کوئی نہیں ہے درمیاں تو

اُس کی تعریف کرتے کرتے
تھکتی ہی نہیں مری زباں تو

کس آگے کروں میں اپنی فریاد
سُنتا ہی نہیں کوئی یہاں تو

تب رحم آئے گا اُس کو مجھ پر
مٹ جائے گا جب مرا نشاں تو

مانا کہ تمہیں یقیں ہے اُس پر
دل ہو گیا اُس سے بدگماں تو

کیوں کر میں سناؤں تم کو ساحؔر
بے لطف ہے اپنی داستاں تو

کاشفؔ مجید

عجب کیا جو میں سرمئی آگ کا منتظر ہوں
نیا آدمی ہوں نئی آگ کا منتظر ہوں

مجھے آگ دکھلا رہی ہے وہ اپنے بدن کی
مگر میں کسی اور ہی آگ کا منتظر ہوں

یہ میری طرف سُرخ شعلوں کی بوچھار، کیسی
ہرا کرنے والے ، ہری آگ کا منتظر ہوں

اُدھر بھی ! کہ وہ بھی تری شعلگی چاہتے ہیں
اِدھر بھی ! کہ میں بھی تری آگ کا منتظر ہوں

ابھی تک جو تُم نے کہیں بھی جلائی نہیں ہے
تمہاری قسم میں اُسی آگ کا منتظر ہوں

☆☆☆

کاشفؔ مجید

روگ بھی یہ روز و شب کا روگ ہے
زندگی کرنا غضب کا روگ ہے

میرے جیسا بھی کوئی روگی نہیں
بے ادب ہوں اور ادب کا روگ ہے

چارہ گر ، اُن کا بھی اب چارہ کوئی
وہ جنہیں نام و نسب کا روگ ہے

روگ مجھ کو چاہیے سب سے جُدا
آنکھ بھر آنا تو سب کا روگ ہے

کب سے تُم پر بند ہے دَر آگ کا
کچھ تو بتلاؤ یہ کب کا روگ ہے

حروفِ زَر

(قارئین کے خطوط)

جنوری 2003 میں انگارے کا پہلا شمارہ ''فیض احمد فیض'' کے گوشے اور سرِ ورق پر ان کی تصویر سے منظر عام پر آیا جس میں آپ نے کہا تھا ''یہ کتابی سلسلہ ادب اور معاشرے میں پائی جانے والی توہم پرستی، رجعت پسندی، مذہبی منافرت، سامراجیت، جذبات سے عاری جذباتیت، غیر منطقیت، فکری انتشار فراریت، لایعنی اور جدیدیت کا نام پر قدامت پرستی کے خلاف ایک ایسا ادب تخلیق کرنے کا جتن ہے جو صلح کل، حق پرستی، مساوات، حب الوطنی، مقصدیت، طبقات سے پاک معاشرے، روشن خیال اور خرد افروزی کا ترجمان ہو تا کہا یک مرتبہ پھر ادب کو آزادی کے جذبے، حسن کی تخلیق، زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے، حرکت پیدا کرنے اور سماج کا تجزیہ کرنے کا ذریعہ بنایا جا سکے۔۔۔!فروری 2003 دوسرے شمارے میں عبداللہ حسین پر آپ نے گوشہ مختص کیا۔۔انگارے کا تیسرا شمارہ ''پروفیسر خلیل صدیقی نمبر'' تھا۔۔۔بعد ازاں انگارے نے اپنے شاندار تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ادب کے سنجیدہ قاری کو ''بیادِ ابنِ حنیف نمبر''، ''ژاں پال سارتر نمبر''، ''یونس جاوید نمبر''، ''منٹو نمبر (تین اشاعتیں)'' اور ''ظفر اقبال نمبر'' دیے جن کے لیے بلاشبہ آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔انگارے'' کا' رواں تخلیقی سفر اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ تمام تر ادبی اور گروہی منافرت سے بلند ہو کر اس جریدے نے اردو ادب کی نہ صرف خدمت کی ہے بلکہ اعلیٰ تخلیقی فن پاروں سے اردو ادب کا دامن مالا مال کیا ہے۔یہ جریدہ کسی بھی گروپ کا آرگن نہیں ہے۔اس نے اپنی منفرد اور جداگانہ شناخت برقرار رکھی ہے اور پہلے شمارے کے اداریے میں اس جریدے کے مدیر نے جس عزم کا اظہار کیا تھا اسے بخوبی اور بہ احسن نبھایا ہے۔

ظفر اقبال نمبر ایک وقیع کام ہے جسے توسیع دے کر آپ ادب میں ایک ایسی کتاب مرتب کر سکتے ہیں جو آنے والے عہد میں Reffeance کا کام دے گی۔میرا اشارہ آپ سب کی محنت ''قرۃ العین حیدر...خصوصی مطالعہ'' کی طرف ہے۔جسے آپ کے ساتھ شوکت نعیم قادری، ڈاکٹر نعمت الحق اور ڈاکٹر علی اطہر نے مرتب کیا۔۔۔ظفر اقبال سے آپ کا اور کاشف مجید کا لیا گیا انٹرویو خاصے کی چیز ہیں۔۔۔ڈاکٹر افتخار بیگ، حمیدہ شاہین، نسیم عباس، سمیرا کلیم اور عمران اذفر کے مضامین قابلِ داد ہیں، تمام تخلیق کاروں نے عرق ریزی سے مضامین لکھے ہیں۔سید سیفو کا مضمون ''ظفر اقبال کے کلام میں پھلوں اور سبزیوں کا ذکر'' اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔ہمارے دوست لیاقت علی کا افسانہ ''SMS'' خوب ہے۔پسند آیا لیکن اگر وہ SMS کو بطورِ علامت لے کر افسانے کی Craft کرتے تو افسانے میں

رمزیت سے معنویت کا اک طلسم ابھرتا۔نوجوان حمزہ حسن نے بھی افسانے ''ادھوری تصویر'' پر محنت کی ہے اوراختتامی جملوں نے افسانے میں حسن پیدا کر دیا ہے۔....

(محمد حامد سراج، چشمہ میانوالی)

ظفر اقبال پر خصوصی شمارہ کا ص طور پر اس اہم اور رجحان ساز ہم عصر شاعر کے مطالعہ کے لئے دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔اس شمارے میں آپ نے انٹرویو، تنقیدی مطالعے، نیا کلام اور شاعر کے تنقیدی عمل، غرض سبھی زاویے شامل کیے ہیں۔انٹرویوز عمدہ ہے، اس لیے کہ صاحبِ گفتگو نے کھلے ڈلے انداز میں گفتگو کی ہے۔خواہ مخواہ کی بقراطیت بگھاری ہے نہ پگڑیاں اچھالی ہیں جو بہت سے لوگوں کا وطیرہ بن گیا ہے۔تنقیدی حصے میں شمیم حنفی کا مضمون دوبارہ پڑھنے کے قابل ہے لیکن یہ حصہ مجموعی طور پر تشنہ رہا۔اس ضمن میں مزید مضامین کی گنجائش تھی لیکن شاید ہمارے ہاں تنقید کم یاب ہوتے ہوتے نایاب ہوتی جارہی ہے۔کہیں تنقید کو خود ظفر اقبال صاحب کی نظر تو نہیں لگ گئی؟ اردو تنقید کا حال اتنا خراب بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ظفر اقبال کے تخلیقی چیلنج کا سامنا نہ کر سکے۔

ویسے ظفر اقبال نے تنقید کی ٹھیک ہی خبر لی ہے۔تنقید کا جب یہ حال ہوگا تو اسی طرح کی باتیں کہی جائیں گی۔ظفر اقبال کے مضامین یا کالم، جو بھی انہیں کہیے، میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ان میں جابجا توجہ طلب نکات اور بحث طلب امور ہیں۔مشکل یہ ہے کہ جو فوری معاملات ان کے احاطہ تحریر میں آنے کا سبب بنے ہیں (کسی شاعر کا مجموعہ، کسی محترم نقاد کا اخباری بیان اور کسی ناراض بوڑھے نقاد کی ادھوری تاریخِ ادب) ظفر اقبال ان سے آگے نہیں بڑھتے بلکہ ان کے گرد گھوم گھوم کر ان پر وار کیے جاتے ہیں۔اس سے ایک طرح کی کالمانہ دلچسپی تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ چیز جسے Critical occassion کہیں گے، وہ گم ہو جاتی ہے۔تنقیدی مضمون بنتے بنتے رہ جاتا ہے، خیر، یہ ان کا انداز ہے۔اب انیس ناگی کی کتاب پر لکھتے لکھتے ان کو نارنگ صاحب یاد آ گئے اور ظفر اقبال نے بیچ مضمون میں اپنی توپوں کا رخ بدل دیا ورنہ ابھی تو انیس ناگی کی کتاب میں بہت گنجائش تھی۔

انیس ناگی نے انتظار حسین پر جو طفلانہ اعتراض داغ دیا ہے اس کا ظفر اقبال نے معقول جواب دیا ہے۔

اور ہاں، نئے کلام کا نیا مزہ ہے۔۶۷ غزلیں ہیں ان کو ۲۷ نشتر کہنا چاہیے، بہر حال اس شمارے نے خوب لطف دیا۔ہم عصر ادب کے تفصیلی مطالعے کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ہاں، پچھلے شمارے میں افسانے کا حصہ نظر انداز ہو گیا۔اس پر توجہ جاری رہنا چاہیے۔اگر افسانے کو نظر انداز کرو گے تو پھر میں خود ہی افسانہ لکھ کر بھیج دوں گا، انتقاماً !

(آصف فرخی۔کراچی)

''انگارے'' کا ۴۷ واں اور ۴۸ واں شمارہ ملا، شکریہ۔ظفر اقبال نمبر اپنے contant میں آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔مستقبل میں ظفر اقبال پر ہونے والے کام میں اس شمارے کو اہم حیثیت حاصل رہے گی۔ظفر اقبال نے اردو غزل کا جو رنگ ڈھنگ قائم کر دیا ہے اب اسے اگر ''ظفریات'' کے نام سے پکارا جائے تو یقیناً کوئی حرج نہیں۔کلاسیکی اور غیر کلاسیکی دونوں اقسام کے اردو غزل گوؤں کے ہاں ''ظفریات'' کی مخالفت میں بھی ایک نقطہ نظر موجود ہے۔خاص کر غیر کلاسیکی غزل گو شاعروں کا ''ظفریات مخالف'' نقطہ نظر اس شمارے میں آنا ضروری تھا۔خیر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس شمارے کے جواب میں آئندہ جگہ پا جائے۔''سمبل'' راولپنڈی کے آخری شمارے میں ''ظفریائی غزلوں'' کا ایک گوشہ نظر سے گزرا ہے۔ان غزلوں پر جلیل عالی جیسے شاعروں کو بھی ناک بھوں چڑھاتے دیکھا گیا ہے۔فنی حوالے سے مجھے بھی ان غزلوں کو ہضم کرنا مشکل رہا۔

''انگارے'' میں سرور کامران، احسان اکبر اور ممتاز اطہر کی نظمیں پسند آئیں۔میری دو نظمیں ایک ہی عنوان کے تحت مسلسل چھپ گئیں۔پہلی نظم تو ''ٹکے بھر کا انسان'' تھی جبکہ دوسری ''وقت کی ایک باسی قاش کا قصہ'' تھی۔ایک دو جگہ پروف ریڈنگ کے مسائل بھی تھے، خیر آپ کی مصروفیات، جانفشانی اور ''انگارے'' کے تسلسل کو ہر حال میں جاری رکھنے کی تگ و دو میں ایسے مسائل قابل اعتراض نہیں۔۔۔کچھ موضوعات پر قلمی مذاکروں کا اہتمام کریں تو بہت عمدہ ہو سکتا ہے۔

(ڈاکٹر روش ندیم۔راولپنڈی)

''انگارے'' کے کتابی سلسلے کی ۴۸ ویں کتاب ''ظفر اقبال'' نمبر سے عبارت ہے۔ظفر اقبال تاریخِ غزل کے اہم شعرا میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔اگرچہ انہوں نے اپنی انفرادیت قائم کرنے کی بعض ایسی شعوری کوششیں کی ہیں کہ ان کے یہاں شعریات کا فقدان محسوس ہونے لگا ہے لیکن لفظیات کے چھوتے استعمال نے انہیں اہم بنانے میں ایک خاص کردار ادا کیا ہے۔۔۔''انگارے'' کا یہ ظفر اقبال نمبر اردو کے ''حوالیاتی ادب'' میں ایک معتبر حوالہ ہے۔اس نمبر سے ظفر فہمی میں بہت سی سہولیات موثر ہوئیں گی۔بطورِ خاص ظفر اقبال سے کیے گئے مختلف انٹرویوز سے ظفر کے تصورِ فن اور ذاتی زندگی کے حوالے سے بہت سی معلومات ملی ہیں۔مضامین میں شمیم حنفی، ڈاکٹر ضیاالحسن، ڈاکٹر افتخار بیگ، حمیدہ شاہین اور سمیرا کلیم نے ماہرانہ انداز میں کلامِ ظفر کا تجزیہ پیش کیا ہے۔مضامینِ ظفر اقبال سے ان کے تنقیدی نظریات سے آگہی ملی ہے اور غزلیاتِ ظفر سے ان کی شاعری کے مزید رنگ سامنے آئے ہیں۔

(مزمل حسین۔لیہ)

☆☆☆